مہوشہ افتخار

مہر ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اپنی کزن جائشہ کی منگنی کی تقریب میں اس لیے شرکت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ حنان سے سامنا نہیں چاہتی جو جائشہ کا بھائی ہے۔ یہ جان کر حنان ملک سے باہر ہے۔ وہ تقریب میں شرکت کے لیے چلی جاتی ہے ۔ لیکن حنان وہاں آجاتا ہے۔ مہر اسے دیکھ کر اپنے گھر واپس آنے کے لیے نکلتی ہے تو حنان سے سامنا ہوتا ہے۔ مہر کے نفرت بھرے رویے پر وہ اسے دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو معاف نہیں کرے گا۔ حنان' زیب بیگم اور صغیر صاحب پر زور دیتا ہے کہ اب مہر کی زندگی کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ وہ کب تک اس طرح کی زندگی گزارتی رہے گی۔ مہر کا نکاح بچپن میں ہوچکا ہے۔

انجم بیگم اور زیب بیگم دونوں بہنیں ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مہر کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو' لیکن صغیر صاحب اس کے لیے راضی نہیں۔ زیب بیگم کو حنان کے گندے کردار کا بھی اندازہ ہے۔

سیم اپنے ماں' باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ نازو نعم میں پرورش پائی۔ اس کی زندگی کی اولین ترجیح دولت ہے۔ وہ امریکہ میں تنہا رہتا ہے اور اپنی ذاتی فرم کا مالک ہے۔ جس میں اس کا دوست مارک شریک ہے۔ وہ آزاد زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے

مکمل ناول
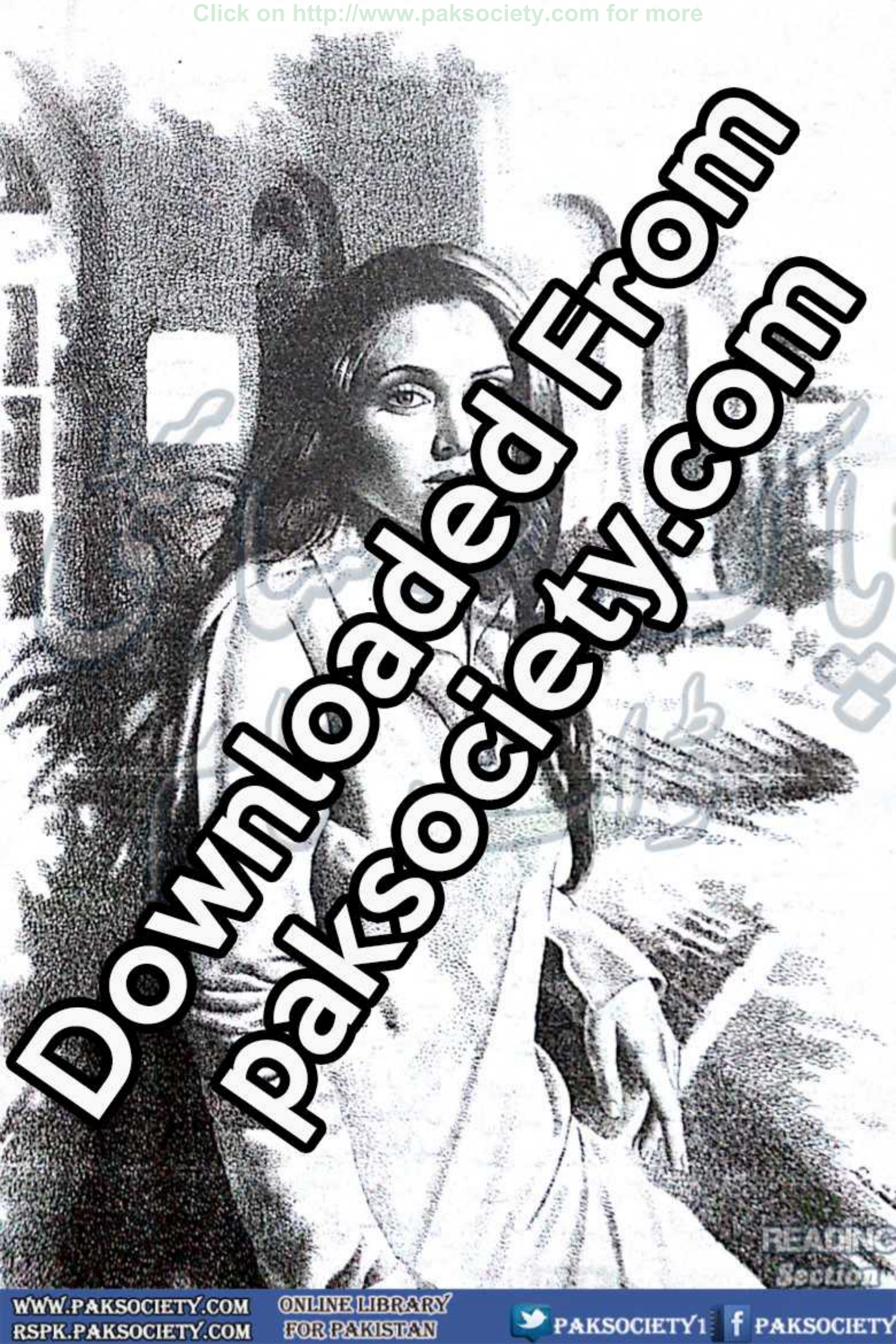
سوزی سے اپنی پسند سے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ایک بار گرل لورین اس کی زندگی میں آئی۔ وہ اس کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہتی ہے۔ پھر ایک دن اس کے فلیٹ کا صفایا کر کے اس کو کچرے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی ہے۔ زمین پر اس کے وجود پر ٹھوکریں مارتی ہے۔ سیم ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی آنکھ اسپتال میں کھلتی ہے۔ اس کا پارٹنر اور دوست مارک اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

سیم پر اس حادثے کا گہرا اثر ہے۔ وہ گم صم ہے۔ اسے بار بار وہ خواب یاد آتا ہے جو اس نے بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ تاریک انجان گلیوں میں دو بھوکے کتے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہا ہے لیکن سب دروازے بند ہیں۔ تب اچانک ایک دروازہ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن اندر نہیں جاتا۔ دوبارہ بھاگنے لگتا ہے۔ تب وہ کچرے کے ڈھیر پر جا گرتا ہے اور تیز بدبو اس کی ناک اور منہ میں گھسنے لگتی ہے۔

اس حادثے کے بعد سیم پہلی بار اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور تب اس کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ کس پناہ گاہ کے دروازے کو کھلا چھوڑ آیا ہے؟

حنان جسے پیار سے ہنی کہتے ہیں صغیر احمد کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔ اس نے آج تک زیب بیگم کو اپنی ماں تسلیم نہیں کیا۔ مہر زیب بیگم کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ حنان اس پر بری نظر رکھتا ہے۔

تموز جو خود کو سیم کہلواتا ہے۔ اس کا نکاح بچپن میں مہر سے کر دیا گیا لیکن مہر اسے پسند نہیں ہے۔ تموز اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آتا ہے تو یہ جان کر کہ اس کا نکاح تموز سے ہو چکا ہے وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

سیم ایک گھر کرائے پر لے کر سوزی کے ساتھ بغیر نکاح کے رہنے لگتا ہے۔ ابراہیم صاحب کو یہ جان کر شدید دھکا لگتا ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

فیصلہ ہو گیا تھا۔ مہر احمد نہ تو کم ظرف تھی اور نہ ہی احسان فراموش۔ اس نے دل کو ایک طرف رکھا اور مصلحتوں کی انگلی تھامے خاموشی سے سب کے ساتھ ایئرپورٹ چلی آئی تھی۔

فلائٹ کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی جاشی اور نویرہ کے درمیان کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ان دونوں کی بے چینی مہر کا دل مزید دکھا گئی تھی۔ کاش کہ یہ مان' یہ حق' حنان نے اسے بھی دیا ہوتا تو آج وہ بھی اتنی ہی خوشی سے اپنے بھائی کی آمد کی منتظر ہوتی جتنی کہ وہ دونوں تھیں۔ مگر حنان کے بے لچک رویے نے اسے ایک بہت پیارے رشتے سے محروم کر دیا تھا۔

اسے اس وقت اپنا آپ قاضی فیملی سے زبردستی جڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ایسا جز جسے کوئی بھی دیکھنے والا بہ آسانی الگ کر سکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اندر احساس محرومی سر اٹھانے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے دل میں کروٹیں لیتے درد کو چھپائے ان چاروں سے قدرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

تب ہی اندر سے مسافروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مہر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے یونہی انجان چہروں کی اس بھیڑ پہ نگاہ ڈالی تھی اور اگلے ہی لمحے اس کی بے نیازی سے بھٹکتی نگاہیں ٹھٹک گئی تھیں۔ شیشے کے بڑے سے دروازے کے اس پار مسافروں کے بیچ اسے حنان کھڑا نظر آیا تھا۔

غیر ارادی طور پر مہر کی نظریں اس پہ ٹھہر سی گئی

تھیں۔ وہ پورے سوا دو سال بعد حنان قاضی کو دیکھ رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ انگلینڈ کی فضائیں حنان کو خوب راس آئی تھیں۔ وہ پہلے سے بڑھ کر نکھرا ہوا اور شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی قابل رشک جسامت اس کے اونچے لمبے قد کو مزید نمایاں کر رہی تھی۔

''کیا پتا ان فضاؤں نے اس کے مزاج پر بھی کوئی مثبت اثرات مرتب کیے ہوں۔'' مہر کے دل نے گمان کیا تھا۔

''وہ رہے بھائی۔'' جاشی کی پکار پہ مہر نے خاموشی سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ بھرپور مسکراہٹ لیے ان کی طرف چلا آیا تھا۔

''السلام علیکم بھائی!'' وہ دونوں لپک کر اس کی طرف بڑھی تھیں اور حنان نے بے اختیار ہی دونوں بازو بہنوں کے لیے وا کر دیے تھے۔ اس درجہ وارفتگی پہ صغیر صاحب اور زیب بیگم دونوں ہی مسکرانے لگے تھے۔ جبکہ مہر کا چہرہ اپنا بھرم قائم رکھنے کو بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ ان دونوں سے الگ ہو کے وہ تیز قدموں سے چلتا باپ کے گلے آلگا تھا۔

''السلام علیکم ڈیڈی۔''

''وعلیکم السلام۔ کیسا ہے میرا بیٹا؟'' صغیر صاحب نے گرم جوشی سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی۔

''فرسٹ کلاس۔ آپ سنائیں؟'' وہ مسکراتے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

اگلی باری زیب بیگم کی تھی۔ حنان قاضی اب کیا کرنے والا تھا مہر شدت سے دیکھنے کی خواہاں تھی۔

باپ سے مل کر حنان کی نظریں زیب بیگم کی طرف اٹھی تھیں اور سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان میں چمکتی محبت نرمی اور گرم جوشی غائب ہو گئی تھی اور ان کی جگہ عجیب سی سرد مہری نے لے لی تھی۔ جذبوں کی اس واضح تبدیلی نے مہر کو سچ میں حیران کر دیا تھا۔ وہ شاکڈ سے اپنے سامنے کھڑے اس کم ظرف شخص کو دیکھے گئی تھی جس نے زیب بیگم کی طرف اٹھنے والی پہلی ہی نگاہ میں مہر کے نادان دل کی ہر خوش فہمی کو دور کر دیا تھا۔

حنان نے انہیں فقط ایک رسمی سا سلام کیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ زیب جیسی پر خلوص اور درگزر کرنے والی خاتون کے لیے وہ بھی بہت تھا۔ ان کا ہاتھ بے اختیار حنان کی پشت پہ آٹھہرا تھا۔

عین اسی لمحے حنان کی نگاہیں بھی اس کی سمت اٹھی تھیں اور وہ ایک پل کو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں مہر کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس چمکتے چہرے پہ سجی اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں حنان کے لیے واضح ناگواری اور غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے وہ بے اختیار ٹھٹک گیا تھا۔

''السلام علیکم۔'' مہر کے مارے باندھے سلام پہ اس نے گہری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ محض سر کے اشارے سے اسے جواب دیتا اپنے سامان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

سب کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ مہر کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے رخ موڑ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب گہری نیند سوئی ہوئی انجم سوتے سے اچانک اٹھ بیٹھی تھیں۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ٹیبل لیمپ روشن کرتے ہوئے انہوں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تھا اور وہاں ابراہیم صاحب کو نہ پا کے ان کا بے چین دل بری طرح گھبرا گیا تھا۔ ابراہیم ملک کمرے میں کہیں بھی نہ تھے۔

تیزی سے خود پہ سے کمبل ہٹاتی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ننگے پاؤں ہی دروازہ کھول کر باہر چلی آئی تھیں۔ جونہی وہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

لیمپ کی نرم سی روشنی میں ابراہیم صاحب سامنے ہی صوفے پہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھے تھے۔

"ابراہیم! آپ، آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟" وہ اڑ کر ان تک آئی تھیں۔ انہیں یوں اچانک اپنے روبرو پا کے ابراہیم ملک نے سرعت سے اپنے بہتے اشک صاف کیے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں اور چہرے کی سرخی بھید کھول گئی تھی۔

"آپ، آپ رو رہے ہیں؟" انجم کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"کچھ تو بولیں ابراہیم۔ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ میرا۔ میرا بچہ تو ٹھیک ہے ناں؟" متوحش سی ہو کے انہوں نے شوہر کا کندھا ہلایا تھا۔ ان کی یہ فکر یہ تڑپ ابراہیم صاحب کا دل چیر گئی تھی۔ وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھے تھے۔

"نہیں مرا وہ بدبخت! کاش کہ وہ مر جاتا تو میرے نصیب میں یہ جلن یہ رسوائی تو رقم نہ ہوتی۔" ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹاتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" انجم نے سہمی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم ہار گئے انجم ... تمہاری تربیت، میرا یقین۔ سب کچھ ہار گیا۔ تمہارا خوف صحیح نکلا۔ یہاں کی بے حجاب فضائیں ہماری شرافت و نجابت کو نگل گئیں انجم!" اور انجم بیگم کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی۔ ان کی وحشت زدہ آنکھیں ابراہیم صاحب کے شکستہ چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔

"شادی ... ! شادی کر لی ہے نا اس نے۔" سینے پہ ہاتھ رکھے انہوں نے کانپتی آواز میں اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا تھا۔ ان کی سادگی ابراہیم ملک کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"تم بہت پیچھے رہ گئیں انجم۔ ہمارے بیٹے نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جہاں ہمارا ذہن پہنچ بھی نہیں سکتا۔" انہوں نے ایک پل کو رک کر اپنی ہمت مجتمع کی۔ "وہ ایک امریکی لڑکی کے ساتھ وہاں بغیر شادی کے رہ رہا ہے۔"

اور انجم ابراہیم کو لگا تھا جیسے پورے گھر کی چھت ان کے سر پر آگری ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شریک حیات کو دیکھتی صوفے پہ گر سی گئی تھیں۔

"انجم!" ابراہیم صاحب تڑپ کر آگے بڑھے تھے۔ ان کے بازوؤں کا سہارا ملتے ہی انجم بیگم بری طرح رو پڑی تھیں۔

★★★

ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے پر مہر سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ تنہائی میں اس نے اپنے اندر جلتے ہوئے احساس تذلیل کو جی بھر کے آنسوؤں کی صورت بہنے دیا تھا۔ عجیب بات تھی لیکن گھر والوں میں سے کوئی بھی اسے دوبارہ بلانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ شاید سب ہی اس کی کیفیت سے واقف تھے۔ اور پھر یونہی روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ جواب کہیں جا کے شام میں کھلی تھی۔

طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ایک گرم پیالی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر شانوں پہ پھیلایا تھا اور دروازہ کھول کے نیچے چلی آئی تھی۔ اپنے لیے ایک اسٹرونگ سا کپ چائے کا بنا کر وہ مگ اٹھائے باہر لان میں آبیٹھی تھی۔

سمٹتی دھوپ اور قدم جماتی شام میں، وہ آسمان کی نیلگوں وسعت پہ نگاہ جمائے چائے کی چسکیاں لے رہی تھی جب اپنے پیچھے کھٹکے کی آواز سن کر اس نے یونہی پلٹ کر دیکھا تھا اور صغیر صاحب کو وہاں کھڑے دیکھ کر وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آئیں ڈیڈی۔" اس نے اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ صغیر صاحب نے ایک نظر اس کی سوجی ہوئی آنکھوں پہ ڈالی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

"آئی ایم سوری بیٹا!" انہوں نے مہر کے سر پہ ہاتھ

رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا اور مہرایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اس کی تکلیف کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اس کے اکیلے پن پہ اپنا دھیان جمائے رکھا تھا۔ ایسے عظیم انسان کے لیے وہ بھلا کیسے کسی قربانی سے دریغ کر سکتی تھی؟

"پلیز ڈیڈی! مجھے شرمندہ مت کریں۔" اس نے بے اختیار ان کی طرف دیکھا۔ تو صغیر صاحب کے چہرے پہ پھیلا ملال مزید گہرا ہو گیا۔

"نہیں بیٹا! شرمندہ تو میں تم دونوں کے سامنے ہو جاتا ہوں' جب ہر بار حنان' زیب اور تم سے بُرے طریقے سے پیش آتا ہے۔" وہ دکھ سے بولے تو مہر خاموشی سے نگاہیں جھکا گئی۔ "میں نے سوچا تھا' اتنے عرصے بعد گھر لوٹا ہے۔ تو اس کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی ہوگی۔ مگر۔۔۔"

وہ افسردگی سے' خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی یہ خاموشی مہر کے لبوں پہ اک تاسف بھری مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔ کچھ ایسا ہی گمان اسے بھی تو ہوا تھا۔

"جگہیں بدلنے سے انسان کے دل نہیں بدلا کرتے ڈیڈی۔" اور صغیر قاضی بے اختیار اپنا لب کاٹ کر رہ گئے تھے۔ "حنان بھائی نے مجھے اور امی کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی آنے والے وقت میں ان سے ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔" مہر نے ایک تکلیف دہ حقیقت بنا کسی پس و پیش کے ان کے سامنے بیان کی تھی اور صغیر صاحب ایک تھکی ہوئی سانس کھینچ کر رہ گئے تھے۔

"بس اللہ تعالیٰ تمہارا نصیب اچھا کرے بیٹا۔ تم اپنے گھر بار کی ہو جاؤ تو میں بھی اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔" وہ جس تناظر میں سوچ رہے تھے۔ اسی میں بولے تو مہر کا دل ایک نئی اذیت سے بھر گیا۔

میرا تو آنے والا کل بھی کسی کی بے رخی نے دھندلا ڈالا ہے ڈیڈی۔ جانے میرے نصیب میں کوئی خوشی کاتب تقدیر نے پوری لکھی ہے بھی یا نہیں؟ تاسف سے سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سیم اپنی گاڑی میں سوزی کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس آرہا تھا۔ جب اپنے گھر کے ڈرائیو وے پہ گاڑی موڑتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سامنے ہی ابراہیم ملک کھڑے اسے پرسکون نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انہیں یوں اچانک اپنے سامنے پا کر اس کا ذہن اس حد تک ماؤف ہو گیا تھا کہ وہ ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھانا ہی بھول گیا تھا۔ نتیجتاً" گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" ساتھ بیٹھی سوزی نے موبائل سے

دعائے مغفرت

ہماری بہت اچھی مصنفہ "بشریٰ سعید" اپنی والدہ محترمہ کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ ہم بہن بشریٰ سعید کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں۔ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

نظریں ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو ونڈ اسکرین کے اس پار گھبرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"سامنے میرے ڈیڈ کھڑے ہیں سوزی۔" اس کی بات نے سوزی کو تیزی سے رخ موڑنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ لیکن ڈرائیوے میں کھڑے اس شخص نے ایک نگاہ غلط بھی اس پہ ڈالنا گوارہ نہیں کی تھی۔ ان کی نظروں کا مرکز صرف اور صرف سیم کی ذات تھی۔

"تم گاڑی میں ہی بیٹھو۔" سوزی کو ہدایت دیتے ہوئے وہ دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔

"آپ یوں اچانک بابا؟" وہ تیز قدموں سے چلتا ان کی طرف آیا تھا۔

"یہاں کب شفٹ ہوئے؟" ان کے اچانک اور غیر متوقع سوال پہ وہ بے اختیار بوکھلا گیا۔

"آ۔۔۔ ہفتہ ہوا ہے۔" اس نے کم سے کم مدت بتانے کی کوشش کی اس سے زیادہ جھوٹ وہ نہیں بول سکتا تھا کیونکہ اندر سارا گھر مکمل طور پہ سیٹ ہوا پڑا تھا۔ میں آپ کو بتانے والا تھا مگر۔۔۔"

"مگر ٹائم نہیں ملا ہو گا۔" انہوں نے پر سکون انداز میں اس کا جملہ مکمل کیا تھا۔

"جی ٹائم کا ہی مسئلہ تھا۔" اس نے کھسیا کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ لڑکی تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" بنا اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹائے، انہوں نے انگلی سے سوزی کی طرف اشارہ کیا تو سیم کی نظروں میں گھر میں موجود سوزی کا سامان گھوم گیا۔ وہ سچ میں بہت برا پھنسا تھا۔

"جی۔۔۔ مگر میرے ساتھ نہیں، ہمارے ساتھ۔" ابراہیم صاحب اس بات سے واقف تھے کہ عموماً "تین چار اسٹوڈنٹس ایک گھر کو شیئر کرتے تھے۔

"اور کتنے اسٹوڈنٹس ہیں یہاں؟" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ باپ کے اتنے سوالوں پہ چڑ جاتا۔ لیکن اس وقت اس کی اپنی سٹی گم تھی۔

"دو لڑکے اور۔۔۔" اور ابراہیم صاحب کا ہاتھ پوری طاقت سے اس کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ "چٹاخ" کی آواز نے گاڑی میں بیٹھی سوزی کو دم بخود کر دیا تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اس کے کھلے منہ پہ آ ٹھہرا تھا۔

"مرد بنو مسٹر سیم! اور مردوں کی طرح اپنے دھوکے کو اون (Own) کرنا سیکھو۔" اسے گریبان سے جکڑے وہ سرد لہجے میں غرائے تھے اور ثموزان کے منہ سے اپنے لیے پہلی مرتبہ "سیم" سن کے ساکت رہ گیا تھا۔

"تم نے ابراہیم ملک کو کیا سمجھا تھا؟ کوئی بے وقوف یا الو کا پٹھا۔ جس کی ناک کے نیچے تم رنگ رلیاں مناتے رہو گے اور اسے خبر تک نہ ہو گی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے وہ غصے سے چلائے تو سوزی کے سامنے اس درجہ تذلیل پہ سیم کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا۔

"گریبان چھوڑیں میرا۔" دانت پیستے ہوئے وہ جیسے پھنکارا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب پہ کوئی اثر نہ پا کے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑیں میرا گریبان۔" دونوں ہاتھوں سے ان کی کلائیاں جکڑتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو؟ ہاں میں منا رہا ہوں رنگ رلیاں۔۔۔ کیا بگاڑ لیں گے آپ میرا؟" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سرکش لہجے میں دھاڑا تو ابراہیم ملک ایک لمحے کو اسے بے یقینی سے دیکھ کر رہ گئے۔ کیا یہ ان کا وہ بیٹا تھا جو ان کی کل کائنات تھا؟

"واہ! کیا انعام دیا ہے بیٹا!" وہ تاسف سے بولتے ایک قدم آگے آئے تھے۔ "ٹھیک ہے اگر یوں ہے تو پھر یونہی سہی۔" ان کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تھے۔ "بہت شوق ہے نا تمہیں عیاشی کا تو کرو۔ ضرور کرو۔ مگر میں اپنی حق حلال کی کمائی تم سے بدعہد اور بدکردار شخص کو ان ناپاک کاموں میں لٹانے کے لیے مر کر بھی نہیں دوں گا۔ میں نے تمہیں جتنا دینا تھا دے دیا اور تم نے میری پیٹھ میں جتنے خنجر گھونپنے تھے گھونپ دیے۔ اب بس!" انہوں نے بے اختیار انگلی اٹھائی

تھی۔

"میں تمہیں آج 'اسی وقت اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ تم ہمارے لیے مرگئے۔ آئندہ میرے گھر میں کبھی قدم رکھنے کی غلطی مت کرنا مسٹر سیم۔ کیونکہ میں اجنبیوں کی 'وہ بھی دھوکے باز اور بدکردار اجنبیوں کی اپنے گھر میں آمد برداشت نہیں کرتا۔" اسے وارننگ دیتے وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر کو بڑھے تھے اور پیچھے کھڑے سیم کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"یہ میری زندگی ہے۔ میں اسے جیسے چاہوں گا ویسے گزاروں گا۔ آپ ان فضول دھمکیوں سے مجھے بلیک میل نہیں کرسکتے۔ سمجھے!" ان کی پشت پہ نگاہیں گاڑھے وہ با آواز بلند دھاڑا تھا۔ مگر ابراہیم صاحب کی رفتار میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ان ہی مضبوط قدموں سے چلتے باہر نکل گئے تھے۔

"تم ٹھیک تو ہو نا سیم؟" ان کے منظر سے ہٹتے ہی سوزی دروازہ کھول کے اس کے پاس دوڑی چلی آئی تھی۔ مگر سیم اسے ایک جھٹکے سے اپنے سامنے سے ہٹاتا 'گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت اتنے شدید غصے میں تھا کہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے انتہائی تیزی سے بیک کی تھی۔ گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔ مگر وہ کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بنا' آندھی طوفان کی طرح گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
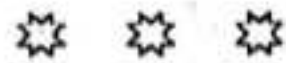
حنان نے مہر کے وجود کو مکمل طور پہ نظرانداز کردیا تھا۔ نتیجتاً" مہر نے بھی اس پہ لعنت بھیجی تھی اور اپنی زندگی میں مصروف ہوگئی تھی۔ اور کچھ یہی ردعمل باقی گھر والوں کا بھی تھا۔

دوسری طرف حنان نے دو تین دن کے وقفے کے بعد ہی صغیر صاحب کا آفس جوائن کرلیا تھا۔ اس کے اس فیصلے سے انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی جوان کے بیٹے نے بنا ان کے کچھ کہے ہی پوری کردی تھی۔

یوں حنان نے دفتر میں اپنی ذمہ داریاں بڑے احسن طریقے سے سنبھال لی تھیں۔ لیکن چند معاملوں میں صغیر صاحب کا اسے ٹوکنا بھی کسی بہتری کا باعث نہیں بن پایا تھا۔ جن میں سرفہرست اس کی حد سے بڑھی ہوئی دوستیاں اور گھر میں زیب خاص طور پر مہر کے ساتھ اس کا بلاوجہ کا ناروا سلوک تھا۔

ابھی بھی وہ رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب گھر واپس لوٹا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کے وہ اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن ٹی وی کے آگے مہر کو بیٹھا دیکھ کے وہ ٹھٹک گیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اور حنان پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بے نیازی سے رخ موڑ گئی تھی۔

اس کی یہ بے نیازی حنان کو سرتاپا سلگا گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اسے یعنی حنان قاضی کو' جس کے پیچھے لڑکیوں کی ایک لمبی قطار تھی' نظرانداز کرنے کی جرات کرگئی تھی۔ جو اسے پہلے دن کی طرح بے حد ناگوار گزری تھی۔ جب اس نے ایئرپورٹ پہ مہر کی آنکھوں میں باقی سب کی طرح اپنے لیے ستائش کے بجائے غصہ اور ناگواری دیکھی تھی۔

وہ اچانک اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر کے اس کی طرف چلا آیا اور بنا مہر کی جانب دیکھے صوفے پہ آکر بڑے ریلیکس انداز میں گر سا گیا۔ یوں جیسے وہ وہاں بالکل اکیلا ہو۔ پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگیں سیدھی کی تھیں اور جوتوں سمیت سامنے موجود ٹیبل پہ رکھ دی تھیں۔

اس کے صوفے پہ بیٹھتے ہی مہر کا سارا دھیان فلم پہ سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس متکبرانہ انداز پہ تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

حنان نے اس کی نگاہوں کی پرواہ کیے بنا ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اٹھایا تھا اور چینل بدل دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک 'وہ چینل سرچنگ میں مصروف ہوگیا تھا اور مہر

لب بھینچے اسے چند لمحے دیکھنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے خاموشی سے وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے۔ لیکن حنان کی تمسخرانہ آواز نے اسے رک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔

"فلم نہیں دیکھنی کیا؟" اور اس کی ذلالت پہ مہر کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ جان بوجھ کے اسے تنگ کر رہا تھا۔

"جی نہیں' آپ کی موجودگی میں مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا۔" ایک سلگتی نظر اس کے چہرے پہ ڈالتی وہ خود پہ سے ہر اختیار کھو بیٹھی تھی۔

اس کے جواب نے حنان کے چہرے پہ تناؤ پیدا کر دیا تھا مگر اس کے لبوں پر کھیلتی تمسخرانہ مسکراہٹ برقرار رہی تھی۔

"بڑے دماغ ہو گئے ہیں بھئی۔" مہر کو دیکھتے ہوئے اس نے بھنویں اچکائی تھیں۔ "مگر شاید تم بھول رہی ہو کہ کس کی چھت کے نیچے کھڑی ہو اور کس سے بات کر رہی ہو۔"

"میں جس چھت کے نیچے کھڑی ہوں فی الحال وہ آپ کی نہیں ہوئی۔ جس دن ہو جائے گی' اس دن یہ رعب دکھائیے گا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ دوبدو بولی تو حنان کے لبوں پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"شاید تم میرے مقابل اترنے کی کوشش کر رہی ہو مہر احمد۔"

"آپ کے مقابل!" مہر نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائی تھیں۔ "نہیں بھائی! میں اتنا نہیں گر سکتی۔" اور حنان کے لیے اتنے کاری وار کی ضرب سہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تھا اور اگلی ہی جست میں اس کی کلائی جکڑ گیا تھا۔

"اب کہو کیا کہہ رہی تھیں تم۔" اور مہر اسے اپنے اتنے قریب پا کے بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی بے اختیار کوشش کی تھی۔

"کیوں یہ ہاتھ صرف ڈیئر ہنی ہی پکڑ سکتے ہیں؟" اور مہر اس کے منہ سے ایک بار پھر اپنے کردار پہ چوٹ سن کر تڑپ اٹھی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور اپنے وجود کی پوری طاقت لگاتے ہوئے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا لیا تھا۔

"آئندہ اگر آپ نے میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" انگلی اٹھائے وہ بنا کسی خوف کے شعلے برساتے لہجے میں بولی تو حنان قاضی کو اس کی یہ جرات آگ لگا گئی۔

"مجھے وارننگ دے رہی ہو تم؟" اس کا چہرہ یک لخت سرخ ہو گیا تھا۔

"ہاں دے رہی ہوں۔ اپنی زبان اور گری ہوئی سوچ سنبھال کے رکھیں۔ میں نے اب تک خاموشی اسے برداشت کیا لیکن یہ فضول بکواس میں دوبارہ کبھی برداشت نہیں کروں گی اور میری یہ بات آپ بھولنے کی غلطی مت کیجیے گا۔" وہ اپنے سابقہ لہجے میں بولی تھی اور حنان کے لیے اس جرات کے مظاہرے کو ہضم کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بے فکر رہو' کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا مہر احمد! ۔ میری یادداشت میں رہنا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"مجھے میری خاموشی بھی بہت مہنگی پڑتی رہی ہے حنان صاحب ۔ اس لیے مجھے اتنی سی بھی پرواہ نہیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ بنا کسی جھجک کے اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھ گئی تھی اور حنان کی مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اٹھو انجم! کچھ کھا لو۔ تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔" ابراہیم صاحب نے آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی انجم بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

پانچ دن ہو گئے تھے اس کرب ناک حقیقت کو ان پہ واضح ہوئے اور ان پانچ دنوں میں ہی انجم جیسے بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں ذہنی دباؤ اور پریشانی

سے دور رکھنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن یہ بھلا ابراہیم صاحب کے ہاتھ میں کہاں تھا؟ وہ تو خود اندر سے بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ تموز کی آنکھوں میں اتری بدلحاظی اور مزاج میں در آنے والی سرکشی اور اجنبیت نے ان کی رہی سہی ہمت بھی توڑ کے رکھ دی تھی۔ وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ انہوں نے امریکہ سے اپنے کاروبار کو ہی سمیٹ لینے کی ٹھان لی تھی۔

"انجم' میں نے پاکستان واپسی کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس سلسلے میں میں نے طاہر سے بھی بات کرلی ہے۔ بہت جلد میں اور تم....."

"میں اور آپ؟" انجم نے ایک جھٹکے سے آنکھوں پر دھرا بازو ہٹاتے ہوئے زخم خوردہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ "ہم یہاں تین بندے آئے تھے ابراہیم اور اب واپس لوٹیں گے تو صرف میں اور آپ!" بھرائے ہوئے لہجے میں بولتی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔" میں ماں ہوں اس نامراد کی۔ کیا کہہ کر اپنے دل کو تسلی دوں؟ اور کیا بتاؤں اپنی بہن کو اور اس بدنصیب لڑکی کو جس کا نصیب ہم نے بچپن میں ہی پھوڑ دیا تھا۔" بات کرتے کرتے ان کے آنسو تیزی سے ان کے چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔

"پانچ دن۔ پانچ دن ہوگئے ہیں مگر ہمارے بیٹے نے ہمیں ایک فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔ مگر پھر میں سوچتی ہوں کہ آج جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس میں کیا صرف ہماری اولاد قصوروار ہے؟" انہوں نے دکھ بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تو ابراہیم ملک اس سوال پہ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔

"نہیں اس میں آپ کی خواہشات بھی شامل ہیں۔ کیا سوچا تھا آپ نے کہ امریکہ آئیں گے' یہاں کی ہر اچھی چیز سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہنسی خوشی رہیں گے؟ نہیں ابراہیم صاحب! آپ کی بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ جب آپ نے یہاں پھلنے پھولنے کے ارادے باندھے تھے نا تو یہاں کی برائیاں اور کمزوریاں بھی آپ کو کامپلمنٹری (تحفتا") ملی تھیں۔" ان کی اس بات پر ساکت بیٹھے ابراہیم ملک کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"کتنا کہا تھا میں نے آپ سے کہ ابراہیم یہاں کا ماحول ٹھیک نہیں۔ مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔ کیونکہ تب تو آپ کے سامنے آپ کا دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا ہوا کاروبار تھا۔ پھر اب اگر اس ترقی کے بدلے میں بیٹا گنوانا پڑ گیا ہے تو کیوں واپسی کے ارادے باندھ رہے ہیں؟ جائیے اپنا کاروبار کیجیے۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس بڑھاپے میں ہم کہیں بھی رہیں' کیا فرق پڑتا ہے؟" اور ابراہیم صاحب کے لیے مزید ان کٹیلی سچائیوں کو سہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کا دل پھٹنے کو آگیا تھا۔

"میں مانتا ہوں سب قصور میرا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں' میں اس اہم ترین نقطے کو بھول گیا کہ جو فضائیں میرے کاروبار کے لیے بہت سازگار تھیں۔ وہ میری اولاد' میری نسل کے لیے بہت ضرر رساں تھیں۔ مگر بہ خدا انجم میں نے یہ نہیں چاہا تھا۔"

احساس زیاں سے مغلوب ہو کے ان کی آواز بھر آئی تھی۔ اور ابراہیم صاحب کے ذہن میں پتا نہیں کہاں سے' لیکن اچانک ہی ان کی اپنی آواز دستک دینے لگی تھی۔

"ٹوٹتا ہے جب جام آرزو
تب در آگہی کھلتا ہے....."

اک سنسناہٹ سی انہیں اپنے پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی تھی۔

"یا اللہ میری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ ان کی درستی کے اسباب پیدا فرما دے۔ بے شک تو ہر چیز پہ قادر ہے۔" بہتے اشکوں کے ساتھ انہوں نے دل کی گہرائی سے اپنے رب سے اپنے غلط فیصلوں کی معافی طلب کی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیم کو اپنی کہی کسی بھی بات کا پچھتاوا نہ تھا۔ بلکہ وہ تو اپنے حوصلے پہ خود حیران تھا کہ اس نے کیسے ابراہیم صاحب کا ہاتھ تھامنا' وہ بھی سوزی کے سامنے برداشت کرلیا تھا ورنہ اس کے نزدیک اگر کوئی اور اولاد ہوتی تو

اس زیادتی پہ کب کا اپنے باپ کو حوالات کی سیر کروا چکی ہوتی۔

اسے ابراہیم صاحب کی دھمکی کی بھی رتی برابر پرواہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرنے والے تھے۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے ماں باپ کی اس میں جان تھی اور وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بابا اگر غصے میں یہ فیصلہ کر بھی لیتے تب بھی اس کی ماں انہیں اس درجہ زیادتی کی اجازت بھی نہیں دینے والی تھی اور اس بات کی اسے امید نہیں بلکہ یقین تھا۔ تب ہی اس نے بے حد اطمینان سے انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ کچھ عرصے کی بات تھی، سب کچھ خود ہی ٹھیک ہو جانے والا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اس بات کو سمجھتے کہ وہ اب ایک سمجھدار اور بالغ شخص تھا، جس کی زندگی کو وہ لوگ اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتے تھے۔ کم از کم اس مہذب معاشرے میں تو بالکل بھی نہیں۔

اس روز سیم نے واپس آکر سوزی کو ہونے والی تلخ کلامی کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ جس پہ سوزی نے اسے مکمل طور پہ سپورٹ کیا تھا۔ اس کے نزدیک سیم کے باپ کا رویہ نہایت غیر مناسب تھا۔ اور وہ اس سلسلے میں کسی نرمی کے مستحق نہ تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" تیار کھڑی سوزی نے سیم کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تھی۔ وہ دونوں ماہانہ گروسری کی خریداری کے لیے قریبی سپر مارکیٹ تک جا رہے تھے۔ سیم اپنی ان سوچوں کے تانے بانے جھٹکتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

گھر بند کر کے وہ گاڑی میں سوار جلد ہی مطلوبہ مارکیٹ آپہنچے تھے۔ جہاں گھنٹہ لگا کے سیم نے بہت تسلی اور فراخ دلی سے سوزی کو گھر کے سامان کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی اشیاء کی بھی شاپنگ کروائی تھی۔

اپنی باری آنے پہ وہ دو دو ٹرالیاں گھسیٹتے کاؤنٹر پہ آ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں موجود لڑکی نے ان کی چیزیں اٹھا اٹھا کر بل بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس دوران سیم اور سوزی کاؤنٹر کے ایک جانب سجائی ہوئی چاکلیٹس میں سے اپنی پسند کی خریداری کرنے لگے تھے۔

"چھ سو پچاس ڈالرز سر۔" کاؤنٹر پہ کھڑی لڑکی نے سکرین پہ جگمگاتا ٹوٹل بہ آواز بلند سیم کے گوش گزار کیا تو اس نے والٹ نکال کر اس میں موجود کریڈٹ کارڈ بے نیازی سے لڑکی کے حوالے کیا تھا اور خود ایک بار پھر سوزی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

"ایکسکیوزمی سر! آپ کا اکاؤنٹ، کارڈ کو سپورٹ نہیں کر رہا۔" لڑکی نے سیم کو مخاطب کیا تو سیم کے ساتھ ساتھ سوزی کی بھی ساری بے نیازی ہوا ہو گئی۔

"کیا؟" وہ سرعت سے پلٹ کر کاؤنٹر کی جانب آیا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں تو ٹھیک ٹھاک رقم تھی۔

"پھر کوشش کریں۔" اس کے کہنے پہ لڑکی نے دوبارہ سارا عمل دہرایا تھا۔

"سوری سر۔" اس نے کارڈ نکال کر سیم کے حوالے کیا تھا اور اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا تھا۔ سوزی الگ اپنی جگہ پہ حق دق سی کھڑی تھی۔ سیم نے فوراً سے پیشتر والٹ نکال کر اس میں رکھا کیش لڑکی کے حوالے کیا تھا۔ اور خود الجھا سا لب بھینچے باہر چلا آیا تھا۔ سوزی اس دوران عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل خاموش رہی تھی۔

وہاں سے گاڑی نکال کر سیم کا رخ اپنے متعلقہ بینک کی جانب ہو گیا تھا۔ جس کی پارکنگ میں اس نے گاڑی کھڑی کی تو سوزی نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نہیں۔" وہ ایک لفظ میں بات ختم کر کے اکیلا ہی اندر چلا آیا تھا۔

"مجھے اپنے اکاؤنٹ کا اسٹیٹس چیک کرنا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اکاؤنٹ نمبر ہیلپ ڈیسک پر بیٹھے شخص کے حوالے کر دیا تھا۔

"سوری سر! آپ کا اکاؤنٹ فریز کروا دیا گیا ہے۔"
اس شخص کی نظریں اسکرین سے ہٹ کر سیم کے چہرے پہ آٹھہری تھیں اور سیم کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔

☼ ☼ ☼

اس رات کے واقعے کے بعد حنان نے مہر سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس کی راہ میں آیا تھا۔ یہ ردعمل مہر کو پرسکون کر گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کاش اس نے پہلے ہی یہ دوٹوک اور سخت رویہ اپنا لیا ہوتا تو آج اس کی عزت نفس اور جذبات حنان کے ہاتھوں مجروح نہ ہوتے۔

لیکن مہر جیسی سادہ اور بے ریا بندی ابھی یہ تلخ حقیقت نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ اپنے سامنے آپ کا جھکا ہوا سر دیکھنے کے عادی ہوں ان کے لیے آپ کی اٹھی ہوئی گردن کو دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔ دشمن کی خاموشی ہمیشہ اس کی پسپائی کا اعلان نہیں کرتی۔ یہ کبھی کبھار اس کے اندر چھپے نئے طوفان کی بھی علامت ہوتی ہے۔ وہ طوفان جسے برپا کرنے کے لیے وہ کسی گھاگ شکاری کی طرح مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں ہوتا ہے اور ان ہی کی حنان کو بھی تلاش تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں گھر جانا چاہ رہی ہوں۔ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔" مہر نے اپنی کنپٹی دباتے ہوئے تھکی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چاروں صغیر صاحب کے ساتھ ان کے عزیز دوست کی بیٹی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں۔ مہر کی طبیعت شام سے ہی گری گری سی تھی۔ مگر چونکہ دلہن سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ اس لیے وہ دوا کھا کر سب کے ساتھ تقریب میں چلی آئی تھی۔ اب اس کو حرارت بھی ہو گئی تھی۔

"مگر بیٹا! ابھی تو نکاح بھی نہیں ہوا۔" زیب نے اس کی بوجھل آنکھوں کو تشویش سے دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں امی! میں حنا سے معذرت کر لوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔ اور پھر وہ ڈرائیور کے ہمراہ گھر واپس آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

حنان جس وقت گھر لوٹا' رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

آج آفس میں ایک پارٹی کے ساتھ ان کی اہم میٹنگ اور پھر ڈنر تھا۔ صغیر صاحب کی چونکہ شادی میں شرکت بھی ضروری تھی۔ اس لیے انہوں نے حنان کو یہ میٹنگ اور ڈنر سنبھالنے کے لیے کہا تھا۔ حنان فارغ ہو کر سیدھا گھر چلا آیا تھا۔

پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے اس نے چوکیدار کو داخلی دروازے کا لاک کھولنے کے لیے کہا تھا۔ جسے وہ سب گھر والے اپنی غیر موجودگی میں بند کر کے جاتے تھے۔

"دروازہ کھلا ہے صاحب جی! وہ مہر بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ واپس آ گئی ہیں۔" چوکیدار کی بات پہ حنان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"کب واپس آئی ہے؟" اس کے اندر کا شکاری چوکس ہو گیا تھا۔ شاید وہ موقع آ گیا تھا۔ جس کا اسے اتنے دنوں سے انتظار تھا۔

"ابھی دس' پندرہ منٹ پہلے ہی آئی ہیں۔" اور وہ اثبات میں سرہلاتا اندر چلا آیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی اس کی آنکھیں مارے خباثت کے چمک اٹھی تھیں۔

وہ دروازے کو لاک لگا کر اوپر چلا آیا تھا۔ احتیاطاً اس نے سب ہی کے کمرے کھول کے چیک کیے تھے۔ پورا گھر خالی پا کے اس پہ سرشاری سی چھا گئی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا مہر کے کمرے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک نہ پا کر اس نے دروازہ دھکیلا۔ اور اندر داخل ہو گیا تھا۔

مہر اندر کمرے میں کہیں نہ تھی۔ لیکن باتھ روم سے پانی کی آواز سن کر اس کے لب بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ اس نے پلٹ کر دروازے کو لاک کیا تھا اور

خود ایک طرف رکھی راکنگ چیئر پہ آ کے بیٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسے کر سکتے ہیں وہ ایسا؟" آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا انہیں گھر لوٹے۔ مگر سیم کا شاک' اس کا غصہ جوں کا توں برقرار تھا۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس روز جو بھی کہہ کر گئے تھے اس میں سے کچھ بھی بے معنی یا اسے محض ڈرانے دھمکانے کے لیے نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے مکمل طور پہ عاق کر چکے تھے۔ اور صرف وہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر چکی تھی اور یہ دھچکا اس کی بہت سی خوش فہمیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اسے غصے کے ساتھ ساتھ شدید قسم کی پریشانی بھی لاحق ہو گئی تھی۔ امریکہ جیسے ملک میں رہ کر بھی اس نے آج تک شہزادوں کی سی زندگی گزاری تھی۔ مشقت کسے کہتے ہیں اور گن گن کر پیسہ خرچ کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ ایسی ہر کڑوی حقیقت سے نابلد تھا۔

"مجھے' مجھے کچھ کرنا ہو گا۔" ڈوبتے دل کے ساتھ یہاں وہاں چکراتے وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔

"کیا کرو گے؟" سوزی نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مجھے انہیں منانا ہو گا۔ انہیں کسی بھی قیمت پہ راضی کرنا ہو گا۔"

"اور اگر ان کی قیمت ہماری علیحدگی ہوئی تو؟" سوزی کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ ابھرے تھے۔

"تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔" لمحے کے توقف کے بعد اس نے اطمینان سے جواب دیا تو سوزی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ سی گئی تھیں۔

"کیا؟"

"ہاں! میں یہ بھی کر گزروں گا۔ مگر..." وہ لحظہ بھر کو رکا تھا اور پھر بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ "مگر صرف عارضی طور پہ۔" اور ساکت بیٹھی سوزی اسے بے یقین نظروں سے دیکھے چلی گئی تھی۔ اس کے تاثرات پہ سیم نے اک گہری سانس لی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

"دیکھو سوزی! ہم دونوں جانتے ہیں کہ اگر میں اپنی فیملی میں واپس جانا چاہتا ہوں تو ان کی یہی شرط ہو گی۔ لیکن دہرانا چاہوں گا۔ میں اس بار جوش سے نہیں ہوش سے کام لوں گا۔ اور اس میں مجھے تمہارے صبر اور تمہارے ساتھ دونوں کی ضرورت ہو گی۔ تمہیں ہر حال میں مجھ پہ یقین کرنا ہو گا۔ کیونکہ میں تمہیں آج ایک بات بالکل سچ سچ بتا رہا ہوں.... میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اس دولت اور اس اسٹیٹس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اسے میری خود غرضی کہہ لو یا کچھ بھی لیکن مجھے یہ سب ہر صورت دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ سو اگر تم یہ سب نہیں کر سکتیں تو مجھے ابھی بتا دو۔ میں اپنا سامان اٹھاؤں گا اور اپنے ماں باپ کو منانے چل پڑوں گا۔" اور سوزی اس کے منہ سے اتنی واضح اور قطعی بات سن کر بے اختیار خاموش ہو گئی تھی۔ صورت حال بالکل کلیئر تھی یا تو وہ اس کے ساتھ تھی یا پھر نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن مجھے دھوکا مت دینا سیم!" اس نے انگلی اٹھائے تنبیہی انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھا تو سیم نے مسکراتے ہوئے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کبھی نہیں۔ مر کے بھی نہیں۔" اور سوزی اس یقین دہانی پہ مطمئن سی مسکرا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہر تولیے سے منہ خشک کرتی اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے راکنگ چیئر پہ جھولتے حنان سے ٹکرائی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"آپ؟" اس نے فقط اتنا ہی کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ کر بیڈ پہ پڑا دوپٹا اٹھایا اور اپنے شانوں پہ پھیلا لیا۔ حنان اس دوران اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھے گیا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے حنان بھائی؟ آپ یوں بنا اجازت

میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟" اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا تھا۔ حنان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔

"بنا اجازت..." میرا کمرہ... کیا استحقاق آگیا ہے تمہارے لہجے میں۔" حنان اس کا چہرہ دیکھتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اس دن بھی کیا کہا تھا تم نے مجھ سے؟" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "ہاں میرے کردار کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ اسے عجیب آرپار ہوتی نظروں سے تکتے ہوئے بولا۔

"آپ' آپ یہاں سے جائیں حنان بھائی۔" اور حنان کا بھاری قہقہہ مہر کی آنکھوں میں سراسیمگی پھیلا گیا۔

"بھائی ہی تو نہیں ہوں میں تمہارا۔" اس کی ہرنی سی خوفزدہ آنکھوں میں تکتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولا تو مہر کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ یہ کون سا حشر برپا ہونے چلا تھا؟ مارے وحشت کے وہ کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"تم تو بہت بہادر ہو میری جان۔ اتنی سی حقیقت سن کے ڈر گئیں۔" اس کے حسین چہرے کا خوف حنان کے اندر کے شیطان کو سکون پہنچا گیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

"خدا کا واسطہ ہے حنان بھائی۔ مجھے میرے عزیز رشتوں کے وہ روپ نہ دکھائیں کہ میں زندگی بھر کسی پر اعتبار کرنے کے لائق نہ رہوں۔" اس کے سامنے ہاتھ جوڑے مہر کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا تھا۔ عزتوں کے محافظ ہی جب لٹیرے بن جائیں تو کوئی کسے مدد کے لیے پکارے؟ کون سی جائے پناہ تلاش کرے؟

"تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں مہر احمد۔ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کو برداشت کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری برداشت کو تمہارا یہ چمکتا وجود بہت عرصے سے آزما رہا ہے سو میں نے سوچا کیوں نہ اس کی یہ آزمائش آج ختم کر دی جائے۔" اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر سہم کر دیوانہ وار پیچھے ہٹی اور دیوار سے جا لگی۔ چشم زدن میں چند سال پہلے کا وہ منظر اس کے ذہن میں گھوم گیا جب رات کی تاریکی میں حنان نے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ اس کے پورے وجود میں اس یاد نے چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔ یہ شخص تو نجانے کب سے اس پہ اپنی گندی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مہر کو سامنے کھڑے حنان سے یک لخت گھن محسوس ہوئی تھی۔

"تمہارا اندر اتنا گندہ ہو گا حنان قاضی! میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ تم سا غلیظ اور بد کردار 'انسان..." اور اس کے ساتھ ہی حنان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے درمیانی فاصلہ ایک ہی جست میں طے کیا تھا اور مہر کو اپنی جانب گھسیٹ لیا تھا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے ذلیل آدمی!" مہر خود کو چھڑانے کی کوشش میں پاگل ہونے لگی تھی۔

"کیوں؟ جب اس کمینے کے ساتھ پہاڑ پہ موج اڑا سکتی ہو تو میرے ساتھ کیوں نہیں؟" دانت پیستے ہوئے حنان نے ایک جھٹکے سے اس کی دونوں کلائیاں قابو میں کی تھیں اور اسے پیچھے دیوار سے لگا دیا تھا۔

"مجھے ہاتھ مت لگانا حنان! میں تمہارا گھناؤنا روپ سب کو دکھا دوں گی۔" مہر وحشت زدہ سی چلائی تھی۔

"تم کیا بتاؤ گی۔ میں خود بتاؤں گا سب کو کہ تم کسی لڑکے کے ساتھ پچھلے لان میں..."

وہ دھیرے سے ہنسا تھا اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہو۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں حنان کے چہرے پہ جم سی گئی تھیں۔ اور اگلے ہی لمحے آنسو قطروں کی صورت اس کی خوب صورت آنکھوں سے پھسلنے لگے تھے۔ یہ منظر اتنا کومل اتنا دلفریب تھا کہ حنان کا دل سچ میں ڈول گیا تھا۔ وہ ان ساحر آنکھوں کا حسن پہلی بار اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا اور ان کی تاب لانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"اُوف جانِ حنان! یہ ظلم نہ کرو مجھ پہ۔" خمار آلود لہجے میں کہتے وہ اس کی طرف جھکا تو مہر نے تڑپ کے اپنا رخ ایک طرف کر لیا۔ اس کی ریشمی زلفیں حنان کے چہرے کو مس کرتی اس پہ خوشبو سی بکھیر گئی

تھیں۔ بے اختیار حنان کو اپنا دل موم کی طرح پگھلتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں حنان' مجھے چھوڑ دو۔" پھوٹ پھوٹ کے روتی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلی تھیں۔

اس کی آواز' اس کی استدعا اچانک جیسے حنان کے دل کو چھونے لگی تھی۔ اس پہ اثر کرنے لگی تھی۔ مہر کی کلائیوں پہ اس کی گرفت میں خود بہ خود نرمی آگئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اس سحرانگیز خوشبو کو اپنے اندر اتارا تھا اور قدرے پیچھے ہٹ کر پہلی بار دل کی پوری آمادگی کے ساتھ' سسکتی ہوئی مہر کے ایک ایک نقش کو اپنے اندر اترنے دیا تھا۔

اس کے ریشمی بال کھل کے بکھر چکے تھے۔ عارضوں پہ جھکی بھیگی گھنیری پلکیں اور دانتوں تلے دبے یاقوتی ہونٹ۔ حنان کے پورے وجود پہ کمندیں سی ڈالنے لگے تھے۔

"یہ سانچے میں ڈھلا مومی وجود تمہاری نفرت کے تو لائق نہیں حنان قاضی۔" اس کے دل نے دھیرے سے سرگوشی کی تو وہ دل کی اس سرگوشی پہ ایمان لے آیا۔ اس نے مہر کی کلائی پہ سے اپنا دایاں ہاتھ ہٹاتے ہوئے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے چہرے پہ بکھر آنے والے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سمیٹتے ہوئے اس کے گال کو سہلایا تو مہر کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ حنان کو خود میں واپس لے آئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے مہر کی دوسری کلائی بھی چھوڑ دی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اس حرکت نے روتی ہوئی مہر پہ جادوئی اثر دکھایا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ اور حنان کو خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دیکھ کے اس کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل گئی تھیں۔ وہ دم سادھے چند سیکنڈ اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اور پھر بھاگ کر اس کے قریب سے گزرتی کارپٹ پہ گرے اپنے دوپٹے کی جانب لپکی تھی۔

"میرا یہ احسان یاد رکھنا مہر احمد۔" دوپٹہ اٹھائے وہ دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ حنان کی آواز نے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر حنان کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اسی جگہ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھٹ رخ موڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اور تیر کی سی تیزی سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے حنان کو ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے اردگرد بکھرا فسوں غائب ہو گیا تھا۔

"یہ اچانک مجھے کیا ہوا تھا؟" اپنی کایا پلٹ پہ وہ حیران تھا۔

"حنان قاضی اور مہر احمد پہ مہربان؟" وہ بے یقینی کے عالم میں بڑبڑایا تو اس کا دل بے اختیار قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

"مہربان نہیں قربان کہو۔ گھائل تو تم بہت پہلے ہی ہو گئے تھے' آج تو صرف آخری کیل ٹھکی ہے حنان قاضی۔" اور حنان اس انکشاف پہ حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بخار کا زور کچھ ٹوٹا؟" زیب بیگم نے تسبیح ختم کر کے مہر پہ پھونکتے ہوئے جاشی کی طرف دیکھا تھا جو بے سدھ پڑی مہر کے ماتھے پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بخار کی حدت کی وجہ سے سرخ ہو رہا اور پپوٹے بے حد سوجے ہوئے تھے۔

"یہ اس کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی کیوں ہیں؟" زیب نے تشویش سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"پتا نہیں امی! مجھے تو خود اتنی پریشانی ہو رہی ہے۔" جاشی کی نظریں بھی مہر کی آنکھوں پہ جا ٹھہری تھیں۔

کل رات بڑی عجیب سی بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ ایک بجے کے قریب واپس آئے تھے اور جس وقت جاشی نے اپنا کمرہ کھولنا چاہا تھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے باہر موجود گھر کی چابیوں سے دروازہ کھولا تھا اور اندر

چلی آئی تھی۔ لیکن بیڈ پہ سکڑی سمٹی مہر کو سوتا دیکھ کے وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی چھوئی تھی۔ جو اچھی خاصی گرم ہو رہی تھی اور پھر وہ اس پہ کمبل ڈال کے اپنے کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی تھی۔

لیکن صبح جب زیب بیگم، جائشہ کو کالج کے لیے اٹھانے آئی تھیں۔ تو مہر کو بے سدھ پڑا دیکھ کے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں حنان کو چھوڑ کے سب ہی گھر والے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ صغیر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کو لینے ان کے گھر بھاگے تھے۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اسے انجکشن لگا کر دوائیاں دی تھیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی تاکید بھی کی تھی۔

ان کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے جاشی فوراً" سے پیشتر پٹیاں لے کر مہر کے سرہانے بیٹھ گئی تھی اور پریشان حال زیب تسبیح لیے اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی تھیں۔ اس دوران جاشی کے کالج کا ٹائم بھی نکل گیا تھا۔

"جاؤ بیٹا جا کر حنان کو اٹھاؤ ورنہ اسے بھی دیر ہو جائے گی۔" زیب کی بات پہ جاشی اثبات میں سر ہلاتی اٹھ کر باہر نکل گئی تھی۔ لیکن حنان کو اپنے کمرے سے نکلتا دیکھ کے وہ بیچ راہداری میں ہی رک گئی تھی۔

"تم کالج نہیں گئیں؟"

"نہیں بھائی! مہر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ شدید بخار کی حالت میں بے ہوش پڑی ہے۔ ڈیڈی ابھی ڈاکٹر عثمان کو واپس چھوڑنے گئے ہیں۔"

"کیا؟" حنان اس اطلاع پہ ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔ پہلی بار اسے مہر احمد سے کی گئی اپنی کسی زیادتی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام تک مہر کا بخار کم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پہ لگے خاموشی کے قفل اور چہرے پہ چھائی عجیب سی ویرانی نے زیب بیگم کو پریشان کر دیا تھا۔

"مہو میری جان۔ اتنی چپ کیوں ہو بیٹا؟" انہوں نے اس کے بال سہلاتے ہوئے اس کا چہرہ نرمی سے اپنی طرف کیا تو مہر کی خالی آنکھیں ان کے پر شفقت چہرے پہ آٹھہریں۔ بے اختیار اس کا دل کل رات خود پہ گزرنے والی قیامت کا ایک ایک پل ماں کو بتانے کے لیے تڑپ اٹھا۔ لیکن حنان کا خوف اتنا شدید تھا کہ وہ اس تڑپ کے باوجود ایک لفظ انہیں نہ بتا پائی۔

ان کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ یکایک مارے بے بسی کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو زیب نے بری طرح گھبرا کے اسے خود میں سمیٹ لیا۔

"کیا ہوا ہے مہر؟ کچھ تو بولو بیٹا؟" مگر ماں کے سینے سے لگتے ہی اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آگئی تھی۔

"امی... امی! مجھے چھوڑ کے مت جایئے گا۔ میں مر... مر جاؤں گی آپ کے بغیر۔" وہ آنسوؤں کے درمیان اٹکتے ہوئے بولی تو زیب کا متوحش دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"کیا بات ہے مہر؟ حنان نے کچھ کہا ہے تمہیں؟" اس سے الگ ہوتے ہوئے انہوں نے یونہی حنان کا نام لیا تو مہر رونا بھول کر خوف زدہ نظروں سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔ اسی وقت زیب بیگم کی نظریں مہر کی کلائی سے ٹکرائی تھیں اور ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

"یہ... یہ کیا ہوا ہے؟" اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہوں نے بغور اس کی کلائی پر موجود انگلیوں کے نشان کو دیکھا تھا۔ کسی انہونی کے احساس نے ان کے اندر بہت شدت سے خطرے کی گھنٹی بجانی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کی دوسری کلائی پکڑی تھی اور وہاں بھی ویسا ہی نشان دیکھ کے ان کی وحشت کے مارے پھیلی آنکھیں مہر کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کی آنکھوں سے ایک بار پھر سیل رواں جاری ہو گیا تھا۔

"امی امی! کل رات حنان میرے کمرے میں..." ان کی گود میں منہ چھپائے مہر فقط اتنا ہی کہہ پائی تھی اور

زیب بیگم نے تڑپ کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔ انہیں "قاضی ولا" کے در و دیوار دھڑ دھڑاتے ہوئے خود پہ گرتے محسوس ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح کاذب کا وقت تھا۔ جب فون کی متواتر بیل سے انجم کی آنکھ کھلی تھی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھایا تھا۔ اور اسکرین پہ اس وقت زیب کا نمبر دیکھ کے وہ بے اختیار گھبرا گئی تھیں۔ سرعت سے فون کان سے لگائے وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔

"ہیلو زیب! خیر تو ہے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی ان کی خیریت دریافت کی تھی۔

"آپا! اگر آپ میرا مرا ہوا منہ نہیں دیکھنا چاہتیں تو آ کر اپنی امانت لے جائیں۔" دوسری طرف سے زیب کی بھاری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو انجم پریشان ہو گئیں۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" لیکن زیب کی اچانک بلند ہونے والی سسکیوں نے ان کا دل بند کر دیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر ایک نظر سوئے ہوئے ابراہیم صاحب پر ڈالی تھی۔ اور اٹھ کر تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں۔

"زیبی! کچھ تو بولو؟ آخر ہوا کیا ہے؟" اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے ان کا حوصلہ جواب دینے کو تھا۔

"آپا' آپا حنان نے مہر کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی ہے۔" اور انجم کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھٹنے کو آ گئی تھیں۔

"کیا؟" انہوں نے اپنے کانپتے وجود کو سنبھالنے کے لیے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔

"ہاں آپا۔" زیب نے بے اختیار سسکی لی تھی۔ اور پھر یونہی روتے ہوئے وہ مہر کی زبانی سنی گئی ساری تفصیل ان کے گوش گزار کرنے لگی تھیں۔ جسے سنتے ہوئے انجم اپنا سر تھامے وہیں راہداری میں بیٹھ گئی تھیں۔

"آپا! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے۔ اگر آپ کو میری اور میری بچی کی ذرا سی بھی پرواہ ہے تو جتنی جلدی ہو سکے یہاں آ کر مہر کو لے جائیں۔ چاہے ثموز مانے یا نہ مانے۔ وہ آپ کے ساتھ آئے یا نہ آئے۔ آپ بس مہر کو یہاں سے لے جائیں۔ پلیز آپا میری بچی کو یہاں سے لے جائیں۔" بات کرتے کرتے وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو انجم کے اپنے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنی مصیبت کی ماری بہن پہ ثموز کی حقیقت کا پہاڑ کیسے توڑتیں بھلا؟

"تم نے صغیر کو یہ بات بتائی؟" انہوں نے لرزتے لہجے میں سوال کیا تو زیب کی آواز میں سراسیمگی پھیل گئی۔

"نہیں آپا! میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی آپ بھائی جان سے اس بھیانک واقعہ کا ذکر کیجیے گا..... یہ تو وہ طوفان ہے کہ اگر اٹھ کھڑا ہوا تو پھر کسی چیز' کسی رشتے کو نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ حنان نے تو باپ کے سامنے ہر حال میں مکر جانا ہے اور میری بچی بچی ہو کر بھی ہر سُو رسوا ہو جائے گی۔ صغیر کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔ لیکن اتنا بڑا الزام اپنے بیٹے پہ کسی طور برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تو مہر کی دوبارہ بھی شکل نہیں دیکھیں گے۔ پھر عائشہ' نویرہ' حنان ان کا بھائی ہے۔ میرا تو پورا گھرانہ بکھر جائے گا آپا!" اور انجم کا دل بہن کی بات سن کر کانپ اٹھا تھا۔

"صحیح کہہ رہی ہو۔ بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔" انہوں نے خوفزدہ ہو کر آنسو پونچھے تھے۔ "میں کچھ کرتی ہوں۔ تم پریشان مت ہونا اور مہو کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلے مت چھوڑنا۔ سنا تم نے؟"

"میں ہر لمحہ اس کے ساتھ ہوں آپا۔" زیب کی یقین دہانی پر انہوں نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"میں ابراہیم سے صبح بات کرتی ہوں۔ تم میرے فون کا انتظار کرنا۔"

"آپا! جو بھی کیجیے گا۔ بس جلدی کیجیے گا۔" زیب کی آواز پھر بھیگنے لگی تھی۔

"تم، تم فکر مت کرو۔" اور زیب نے رابطہ منقطع

کر دیا تھا۔
انجم نے ہاتھ میں پکڑے فون کو بے جان نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طرف ڈال دیا تھا اور نڈھال سے انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کریں؟ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

☼ ☼ ☼

زیب حاجت کے نفل پڑھ کر اٹھیں تو اپنے پیچھے حنان کو کھڑا دیکھ کے بے اختیار چونک گئیں۔ اس کی صورت ان کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی مگر انہوں نے کمال حوصلے سے خود پہ قابو پاتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ان کے چہرے پہ نگاہ جمائے حنان ایک پل کے لیے رُکا تھا۔

"میں مہر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے پرسکون اور دو ٹوک الفاظ میں بولا تو زیب اس کی دیدہ دلیری پہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" ان کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا تھا۔

"کیوں آپ کو اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟" ان کی ناگواری کی پروا کیے بنا وہ اسی سکون سے بولا تو زیب کو اپنا ضبط چھوٹتا محسوس ہوا۔

"مجھے اس کی شادی کرنی ہے یا نہیں۔ لیکن تمہارا میری بیٹی سے کوئی رشتہ نہیں جڑ سکتا۔" وہ انگلی اٹھائے غصے سے بولیں تو حنان کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"کیوں؟"

"کیا تم وہ سب کچھ بھول گئے ہو جو آج تک اس کے ساتھ کرتے رہے ہو؟ اور آج تم میرے سامنے کھڑے ہو گئے ہو اس سے شادی کا ارادہ لے کے۔ کیا سوچ کر تم نے مجھ سے یہ بات کی ہے۔ ہاں.....؟" زیب کا غصہ سے برا حال تھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ اچھی لگنے لگی ہے وہ مجھے۔" ان کی اتنی کھری کھری کے باوجود وہ بے نیازی سے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو زیب کو اس کی اس درجہ ڈھٹائی اور جرات گنگ کر گئی۔

"تمہیں احساس بھی ہے کہ تم کس سے اور کیا بات کر رہے ہو؟" اس کی طرف دیکھتی وہ بے یقین لہجے میں بولی تھیں۔

"لڑکی کی ماں سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا؟" وہ دو بدو بولا۔

"ٹھیک ہے۔ لڑکی کی ماں ہوں نا میں تو مجھے تمہارا رشتہ قبول نہیں حنان قاضی۔" اس کی طرف دیکھتی وہ سرد لہجے میں بولیں تو حنان کی آنکھوں میں غصہ پھیل گیا۔

"تو آپ مجھ سے پرانے بدلے نکالیں گی؟"

"میں تمہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتی حنان!" زیب نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ان کی یہ کاری ضرب حنان کے پورے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئی۔

"بہت بڑی بات کہہ گئی ہیں آپ۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا مسز صغیر۔ میں اپنی ضد کا بہت پکا ہوں۔ جب وہ مجھے بری لگتی تھی تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے وجود کو مجھ سے نہیں منوا سکتی تھی۔ آپ تو خود بھی اس تجربے سے گزری ہیں نا ساری عمر۔" وہ یک لخت کاٹ دار انداز میں مسکرایا تو زیب بیگم کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "اور اب جبکہ وہ حیرت انگیز طور پہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ تو یقین مانیں دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے دور نہیں کر سکتی۔ اس لیے میرا مشورہ ہے مسز صغیر اس لڑکی کو میری ضد مت بنائیں۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے حنان نے سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔ زیب کے لبوں پہ عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دنیا کی کوئی طاقت نہ سہی، لیکن اوپر والے کی طاقت تو تمہیں روک ہی سکتی ہے نا۔ مہر تمہارا نصیب نہیں بن سکتی۔"

"آپ مجھے چیلنج کر رہی ہیں؟" ان کی مسکراہٹ، ان کا پرسکون انداز حنان کو کھولا گیا تھا۔

"نہیں! سمجھا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر۔ آپ بھی ایک بات سمجھ لیں۔ مہر اگر میرا نصیب نہیں بن سکتی، تو پھر، کبھی کسی اور کا نصیب بھی نہیں بنے گی۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا یک لخت ٹھہرے ہوئے لیکن سرد لہجے میں کہتا، وہ باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور پیچھے کھڑی زیب کی آنکھوں میں پہلی بار اپنے ہاتھوں کے پالے اس لڑکے کے لیے نفرت پھیل گئی تھی۔ انہوں نے مہر سے اس گفتگو کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اسے مزید خوف زدہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ انجم کتنی ہی دیر سے یونہی چپ چپ سی بیٹھی تھیں۔ انہیں یوں خاموشی سے ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا دیکھ کر ابراہیم صاحب نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے ان کی جانب دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ہم ناشتہ کیوں نہیں کر رہیں؟"

"آپ کو پتا ہے ابراہیم۔ آج صبح ساڑھے چار بجے کے قریب زیب کا فون آیا تھا۔" انہوں نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر تو تھی؟" ابراہیم صاحب کے چہرے پہ پریشانی پھیل گئی۔

"اس نے مجھ سے فوری طور پہ مہر کی رخصتی کے لیے کہا ہے۔" انجم نے دھیرے سے بتایا تو ابراہیم ملک حیرت سے ان کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"اس نے ساڑھے چار بجے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا؟"

"جی۔ وہ بہت زیادہ رو بھی رہی تھی۔ شاید اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔" انجم نے ڈھکے چھپے لہجے میں بتایا۔

"تم نے پوچھا نہیں اس سے کیا ہوا ہے؟" ابراہیم صاحب نے پریشانی سے سوال کیا۔

"بہت پوچھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ صغیر سے بھی اس معاملے میں کوئی بھی بات کرنے سے اس نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"پھر اب؟" اور انجم، ابراہیم صاحب کا اشارہ سمجھ کے ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

"یہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں ابراہیم! کہ اب ہم کیا کریں گے؟"

"تمہیں زیب کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے انجم۔ ہم مہر کی زندگی تباہ نہیں کر سکتے۔" ابراہیم ملک دو ٹوک لہجے میں بولے تو انجم کے چہرے پہ بے بسی پھیل گئی۔

"سوچا تو میں نے بھی یہی تھا کہ اپنی بہن سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اسے صاف صاف بتا دوں گی کہ ہنی ہماری مہر کے لائق نہیں۔ وہ مہر کا یہ بے معنی رشتہ توڑ کر اس کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ لے۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا ابراہیم۔ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ تو یہ تک کہہ رہی تھی کہ چاہے ہنی آئے یا نہ آئے مانے یا نہ مانے۔ ہم خود آ کر مہر کو وہاں سے لے جائیں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے انجم؟ ہم یہ سب کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟" ان کی بات سن کے ابراہیم صاحب تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تب ہی ملازمہ معذرت کے ساتھ اندر چلی آئی تھی۔

"سر! سیم سر آئے ہیں۔" اور ابراہیم ملک کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔

"اس کی اتنی جرأت!" وہ آندھی طوفان کی طرح اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھے تھے اور انجم ہراساں سی ان کے پیچھے لپکی تھیں۔ ان کی منتوں کے باوجود ابراہیم صاحب نے لاؤنج میں کھڑے سیم کو جا کر اس کے گریبان سے جکڑ لیا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی؟" کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے انہوں نے اسے زوردار جھٹکا دیا تھا اور انجم نے دہل کر اپنا کلیجہ تھام لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں بابا!" ان کے چہرے کو تکتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا تو ابراہیم ملک کا غصہ دوچند ہو گیا۔

"معاف؟ اور وہ بھی ایک زانی کو؟ نو نیور۔" انہوں نے اسے دور دھکیلا تو سیم پیچھے گرتے گرتے بچا۔ "اور تمہیں یہ معافی یاد آئی کیسے؟ اکاؤنٹ بند ہو گیا اس لیے؟"

انہوں نے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس انکشاف نے دروازے میں کھڑی انجم کو حیران کر دیا۔ وہ اتنا بڑا قدم اٹھا چکے تھے اور انہیں بتایا تک نہ تھا۔

"آپ نے میرا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے؟" سیم نے انجان بننے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"یہ ڈرامہ کسی اور کے سامنے جا کر رچاؤ۔" ابراہیم ملک نے کان پہ سے مکھی اڑائی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں بابا! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔" اس کی دہائی پہ ابراہیم صاحب کی تیز نظریں اس کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔

"تو ٹھیک ہے اب جان لو۔ میں تمہیں اپنی ساری دولت اور جائیداد سے عاق کرنے والا ہوں اور اسی لیے میں نے تمہارا اکاؤنٹ بند کروا دیا ہے۔" اور سیم کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر اس نے اپنے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں آنے دی تھی۔

"وہ آپ کی ملکیت 'آپ کی چیز ہے۔ آپ جو چاہیں 'وہ فیصلہ لیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر پلیز' پلیز ایک بار مجھے معاف کر دیں بابا! میں اتنی راتوں سے سو نہیں سکا ہوں!"

ان کی طرف دیکھتا وہ دھیرے سے آگے بڑھا تھا اور انجم نے اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو لبوں پر تیزی سے دوپٹہ رکھ لیا تھا۔ یہ ان کی اکلوتی اولاد انہیں کس دوراہے پر لے آئی تھی؟

"میں اپنے مجرم کو تو معاف کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے اللہ کے مجرم کو معاف کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ سیم۔" بات کرتے کرتے ابراہیم صاحب اس کی طرف سے رخ موڑ گئے تھے۔ سیم تیزی سے ان کے قدموں میں آگرا۔

"پلیز بابا! یوں مت کہیں۔ میں آپ لوگوں کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں سیم نہیں آپ کا ثموز ہوں۔ مجھے معاف کر دیں بابا۔ میں ... میں پھر دوبارہ یہ حرکت کبھی نہیں کروں گا۔" ان کی ٹانگوں سے لپٹے اس کی اداکاری عروج پہ تھی اور انجم کے آنسو تھے کہ رکنے میں نہیں آرہے تھے۔ وہ بے تابی سے شوہر کی جانب بڑھی تھیں۔

"پلیز ابراہیم! معاف کر دیں نا۔" ان کے بازو پہ ہاتھ رکھے وہ لجاجت سے گویا ہوئی تھیں۔ ابراہیم صاحب نے ایک نظر ان کی برستی آنکھوں کو دیکھا تھا اور نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"ایک شرط پہ۔" وہ بے تاثر آواز میں بولے تو سیم کو لگا جیسے اس کی مشکل آسان ہو گئی ہو۔ وہ خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آپ کی ہر شرط قبول ہے بابا۔" زیادہ سے زیادہ وہ سوزی کو چھوڑنے کی بات کرنے والے تھے۔ اور یہ تو وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

"ہم تینوں اگلی کسی بھی فلائٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔" اس کی طرف رخ موڑتے ہوئے انہوں نے قطعی لہجے میں سیم کے سامنے وہ شرط رکھی تھی جس کے بارے میں اس نے گمان بھی نہ کیا تھا۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ کسی اگر مگر کی گنجائش بچی ہی نہ تھی اس کے پاس۔

"ٹھیک ہے۔" ہتھیار ڈالنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا اور ساکت کھڑی انجم کو لگا تھا جیسے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔ جس نے لمحوں میں ان کی ہر اذیت 'ہر پریشانی کا مداوا کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا' ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک گمراہی کے راستے سے لوٹ آیا تھا۔ وہ اپنی بہن اور بھانجی کے سامنے رسوائی اور جگ ہنسائی سے بچ گئی تھیں' انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔

"انجم ..." سیم کے اپنے کمرے میں جاتے ہی ابراہیم ملک نے بیگم کو پکارا تھا۔

"ہم جب تک پاکستان نہیں پہنچ جاتے تم ثموز

سے رخصتی یا میرے یہاں سے کاروبار سمیٹنے کا ذکر بالکل مت کرنا۔" اور انجم نے انہیں دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ تموز اگر ان کا بیٹا تھا تو وہ اس کے باپ تھے۔ اسے راہ راست پہ کیسے لانا تھا، وہ اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔

حنان والے واقعے کو گزرے محض تین دن ہی ہوئے تھے۔ جب انجم نے فون کر کے زیب کو اپنی آمد کی خوش خبری سنا دی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ ہنی کی آمد کا سن کے زیب بے اختیار سجدۂ شکر میں گر گئی تھیں۔ ان دو سوا دو سالوں میں ہنی کی ذات سے پیدا ہونے والا ہر خدشہ، ہر گلہ خود بہ خود دور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ان کی بیٹی کو عزت کے ساتھ رخصت کروانے کے لیے آ رہا تھا۔ انہیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے تھا۔

انہوں نے یہ خوش خبری مہر کو سناتے ہوئے فی الوقت رخصتی کی بات کو خود تک محدود رکھنے کی تاکید کی تھی۔ وہ اس چھپے ہوئے نکاح کو آخری وقت حنان کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

نجانے کتنی بے خواب اور سہمی ہوئی راتوں کے بعد مہر کو آج سکون کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ وگرنہ جاشی کے برابر میں ہوتے ہوئے بھی وہ ساری ساری رات ڈر کے مارے جاگتی رہتی تھی۔ ان تین دنوں میں اس کی ماں نے اس کے گرد یوں حصار باندھا تھا کہ حنان کی صورت بھی اسے دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ بالکل چپ سی ہو گئی تھی۔ بخار ٹوٹ جانے کے بعد بھی وہ جاشی کے کمرے کی چار دیواری سے نکلنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا اپنا کمرہ اس دن سے خالی پڑا تھا۔ مہر کو وہاں جانے کا سوچ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ لیکن اب جب سے اس نے ہنی کی آمد کا سنا تھا۔ اس کے وجود پہ چھایا جمود ٹوٹ سا گیا تھا۔ رات شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد اس نے اتنے دنوں میں

پہلی بار رغبت سے کھانا کھایا تھا اور پھر اس کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ مگر خلاف معمول نہ وہ ڈری تھی اور نہ خالی الذہنی کے عالم میں در و دیوار کو تکتی ہولتی رہی تھی۔ بلکہ وہ چند ہی لمحوں میں بڑی گہری اور پر سکون نیند سو گئی تھی۔ نتیجتاً" اس کی آنکھ اپنے پرانے معمول کے مطابق فجر کے وقت کھل گئی تھی۔ اس نے بڑی دل جمی سے اٹھ کر نماز فجر ادا کی تھی۔

نماز پڑھ کے اس کے دل کو بے حد سکون ملا تھا اور اسی سکون بھری کیفیت میں اس کا دل اوس میں بھیگی نرم گھاس پہ چہل قدمی کے لیے مچل اٹھا تھا۔ وہ بلا ارادہ ہی اٹھی تھی اور دروازہ کھول کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

باہر ہر سو مکمل خاموشی تھی۔ زیب بیگم کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہو چکی تھی۔ شاید وہ نماز پڑھ کے دوبارہ لیٹ گئی تھیں۔ رہا حنان تو وہ تو اس وقت اٹھنے کا عادی ہی نہیں تھا۔ سو مہر اطمینان سے قدم اٹھاتی نیچے چلی آئی تھی اور داخلی دروازہ کھول کے باہر لان میں نکل آئی تھی۔

وہ پاؤں میں پہنی چپل اتار کے نرم ٹھنڈی گھاس پہ ٹہلنے لگی تھی اور اسی وقت حنان اپنے کمرے میں کھڑکی کے پردے برابر کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا تھا۔

رات ہنی کی آمد کا سن کے وہ اتنا بدمزہ ہوا تھا کہ کھانا چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف نکل گیا تھا اور پھر وہیں ان کے درمیان ساری رات گزار کے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر لوٹا تھا۔ وہ سونے کے ارادے سے کھڑکی کے پردے برابر کرنے کو آگے آیا تھا۔ اور تبھی اس کی نظر لان میں ٹہلتی مہر پہ پڑی تھی۔ اس کی اتنے دنوں کی فرسٹریشن عود کر آئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے پردہ چھوڑ کر پلٹا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا تھا۔

"اچھا وقت ہے اپنی پناہ گاہ سے نکلنے کا۔" اور اپنے دھیان میں ٹہلتی مہر کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح قبض کر لی ہو۔ وہ اتنی وحشت زدہ ہوئی تھی کہ اس میں

پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔

"تم نے سوچا ہو گا کہ حنان تو سو رہا ہو گا مگر.... چچ چچ - ادھر مہر صاحبہ نے قدم باہر نکالا اور ادھر...." وہ قصداً" بات ادھوری چھوڑ کے ہنسا۔ مہر نے بھاگ کر وہاں سے اندر جانے کی کوشش میں جونہی قدم بڑھائے، حنان نے تیزی سے آگے بڑھ کے اس کا راستہ روک لیا۔

"اوں ہوں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" مہر کے فق ہوتے چہرے پہ نگاہ جمائے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

"پتا ہے' تمہارے اس خوب صورت چہرے پہ کبھی یہ خوف دیکھنے کی میں نے بڑی تمنا کی تھی۔ مگر آج جب یہ پھیلا ہے تو یقین مانو ذرا اچھا نہیں لگ رہا۔ جانتی ہو کیوں؟" وہ ایک قدم آگے آیا تو مہر کتنے ہی قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"کیونکہ تمہارے معاملے میں یہ دل اچانک ہی میرے مقابل ڈٹ گیا ہے۔ محبت ہو گئی ہے مجھے تم سے مہر احمد!" اس پر نظریں جمائے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ مہر کی آنکھیں مارے بے یقینی کے پھیل سی گئیں۔

"یقین نہیں آ رہا نا۔ کوئی بات نہیں.... اپنی ماں سے جا کے پوچھو۔ ہاتھ مانگا ہے میں نے تمہارا۔" اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کے اعصاب پہ کوئی بم آ گرا ہو۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" اتنی دیر میں پہلی بار اس کے ہونٹوں نے جنبش کی تھی۔

"یہی سوال اس دن تمہاری ماں نے بھی پوچھا تھا۔ خاصا تفصیل سے جواب دیا تھا میں نے انہیں' تمہارے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ اس روز کے بعد سے بھا گئی ہو تم مجھے' اور جو چیز حنان قاضی کو بھا جائے وہ بھلا کہیں اور کیسے جا سکتی ہے؟" اس کی طرف دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی آنکھوں میں پھیلی بے یقینی نفرت میں ڈوب گئی۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں حنان قاضی! جو تم جیسا گندہ آدمی مجھے اٹھا کر اپنے کمرے میں سجا لے گا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت! اپنے اندر کی ہوس کو محبت کا نام دے رہے ہو۔ تمہیں تو ڈوب کر مر جانا چاہیے۔"

"تمہیں پتا ہے مہر احمد۔ تمہارا یہ گریز' یہ نفرت۔ میری ضدی طبیعت کو اور بھی تمہاری جانب مائل کر رہا ہے۔ اب تو اگر تم سے محبت نہیں بھی ہے۔ تب بھی شادی تو تم سے ہی کرنی ہے مجھے۔" وہ عجیب سے سرد اور قطعی لہجے میں گویا ہوا تھا۔

اس کے انداز نے بے اختیار مہر کو اس بات کا احساس دلایا تھا کہ کیوں زیب اس کے نکاح کی خبر کو آخری وقت تک حنان سے چھپانا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی کمینگی پہ اترا ہوا تھا کہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

"بھول ہے تمہاری۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" مہر دوبدو بولی تھی۔

"آج تو بہت ہمت آ گئی ہے۔ کس کا زعم ہے جان حنان! کہیں ڈیئر ہنی کا تو نہیں؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تو مہر بے اختیار خاموش ہو گئی۔ اس کا سہما ہوا دل اندر ہی اندر مزید سہم گیا۔

"ایک بات یاد رکھنا مہر۔ اس بار اگر تم مجھے اس شخص کے ارد گرد نظر آئیں۔ تو میں تمہارا تو نہیں' البتہ اس کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دوں گا!" انگلی اٹھائے وہ اچانک تنبیہی انداز میں بولا تو مہر کی سانس ایک پل کو رک سی گئی۔

"تم مجھے پابند نہیں کر سکتے۔" اپنے گرتے حوصلے کو سنبھالے اس نے ہمت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پابند تو تمہارا باپ بھی ہو گا۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لینا۔" اور مہر اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتی' دوسری طرف سے نکل کے تیز قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ صد شکر تھا کہ اس نے مہر کو جانے دیا تھا۔

کمرے کی محفوظ چار دیواری میں پہنچ کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ مضبوطی سے بند کیا تھا اور اپنے لرزتے وجود کو سنبھالے وہیں کارپٹ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"کہاں ہیں آپ ہنی! پلیز جلدی آ جائیں۔" گھٹنے

پہ پیشانی ٹکائے وہ بے آواز سسک اٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے چار' پانچ دن بڑی تیزی سے گزرے تھے اور ثموز ابراہیم پورے سوا دو سال بعد ایک بار پھر وہیں آ پہنچا تھا۔ جہاں کے نام سے بھی اسے چڑ تھی۔ یہاں تک آنے کے لیے اس نے سوزی کو کیسے قائل کیا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔ مگر اس کا اپنا دل' اپنے باپ کی طرف سے بری طرح کھٹک گیا تھا۔ ان کا یوں اسے پاکستان لانا ہرگز بے مقصد نہ تھا۔

زیب کے گھر میں اس کا پہلے کی طرح بھرپور استقبال ہوا تھا۔ وہ اس سے اتنی ہی بھرپور محبت سے پیش آئی تھیں۔ جس طرح ہمیشہ آتی رہی تھیں۔ رہی مہر تو اس کی نظریں پہلے بھی اس کے سامنے جھکی رہتی تھیں اور اب بھی جھکی ہوئی ہی تھیں۔ مگر اس کا چہرہ اس کی اندرونی خوشی کی عکاسی' آئینہ بن کے کر رہا تھا۔ وہ اس تمام عرصے میں پہلے سے بڑھ کر پیاری ہو گئی تھی۔ اتنی جاذب نظر کہ ایک پل کو تو ثیم بھی ٹھٹک کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز نے مہر کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا کر دیا تھا۔ ہنی کی ذات سے جڑے اس کے سارے شکوے' ساری منفی سوچیں اپنے آپ مٹ گئی تھیں اور اس کی ذات پہ ان دو سالوں سے چھائے مایوسی کے بادل چھٹ کر کہیں دور چلے گئے تھے۔ وہ انجم کے بازو کے گھیرے میں کتنی ہی دیر شاداں اور پر سکون بیٹھی مسکراتی رہی تھی۔

کھانے کے بعد جس وقت کافی کا دور چلا تھا۔ تب حنان نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی انجم کی بھنویں تن گئی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھری محفل میں اس کے چہرے پر سے شرافت کا یہ نقاب نوچ لیں۔ اس کے بد دلی سے کیے گئے سلام کا جواب انہوں نے اس سے بڑھ کر سرد مہری سے دیا تھا۔ جبکہ ثمرذہ سے اس نے اس تکلف کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ اسے مکمل طور پہ نظر انداز کیے اس کے عین مقابل ٹانگ پر ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی یہ بدتمیزی ثمرذہ کا خون کھولا گئی تھی۔ دونوں کی نگاہیں پل بھر کو ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔ اور دونوں پہ ہی ان کی ناگواری اور بے زاری واضح ہو گئی تھی۔

"اچھا تو زیب اور صغیر' میرے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے۔ جب ہمیں اپنے بچوں کے رشتے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔"

ابراہیم ملک کی آواز پر ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ہٹ کر ان کی طرف اٹھی تھیں۔ مگر ان کی بات کے اختتام تک دونوں کے ہی رنگ بدل گئے تھے۔ ثمرذہ کی رنگت فق۔ جبکہ حنان کے چہرے پہ نا سمجھی بھری الجھن آ ٹھہری تھی۔

"میں اس جمعے کو مہر کی رخصتی چاہتا ہوں۔" اور حنان کو لگا تھا جیسے گھر کی چھت اس کے سر پہ آ گری ہو۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے طے ہوتی ضروری باتوں کو سن رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں کمرہ مبارک سلامت کی خوشیوں بھری پکار سے بھر گیا تھا۔ مہر احمد بچپن سے ثموز ابراہیم کے نکاح میں تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ نویرہ' جائشہ کی بے یقینی بھی عروج پہ تھی۔ سب بے تحاشا خوش تھے۔ سوائے ان دونوں لڑکوں کے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو کے بھی اس پل ایک ہی صدمے سے دوچار تھے۔ اچانک ملنے والی ہار کا صدمہ۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ایک مہر احمد کو کھو کر ہارا تھا۔ اور دوسرا اسے پا کر ہارا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" اپنے کمرے میں تنہائی ملتے ہی ثموز ماں باپ پہ پھٹ پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اپنے ہی لالچ کے ہاتھوں بندھے تھے۔ وہ اس لمحے مکمل طور پر بے بس تھا۔

"کیوں تمہاری شادی نہیں کرنی ہمیں؟" اس کے برعکس ابراہیم ملک بالکل پرسکون تھے۔

"آپ لوگ جانتے ہیں۔ میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار اپنی اس آنکھ مچولی کو زبان دی تھی۔

"ہم کیسے جان سکتے ہیں؟ تم نے آج سے پہلے تو یہ بات کبھی ہم سے نہیں کہی۔" ابراہیم صاحب کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"انجان مت بنیں بابا! آپ دونوں جانتے ہیں کہ میں نے کبھی مہر میں کوئی انٹرسٹ شو نہیں کیا۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ تمہارا انٹرسٹ تو اور بہت سی چیزوں میں رہا ہے۔" پُرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے چوٹ کی تو سیم کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"مگر کیا ہے تموز صاحب! آپ کو اپنی فیملی میں دوبارہ قبول کرنے کے لیے میری یہی شرط ہے۔" وہ اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے انتہائی پرسکون لہجے میں گویا ہوئے تھے۔ ان کا بے لچک انداز سیم کے اندر بے یقینی بھر گیا تھا۔

"آپ، آپ اس تھرڈ کلاس لڑکی کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟"

"وہ تھرڈ کلاس ہے یا فرسٹ کلاس۔ ہماری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔ ابھی جاؤ۔ ٹکٹ کٹاؤ اور امریکہ پہنچ جاؤ۔ ہم میں سے تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔" وہ رسان سے کہتے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو تموز کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ نکلیں۔

"یہ زور زبردستی ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں دے پائے گی بابا!" وہ باپ کی طرف دیکھتا سرد لہجے میں بولا تو خاموش تماشائی بنی بیٹھی انجم کا دل ڈوب سا گیا۔ واقعی اگر وہ زبردستی ہنی اور مہر کو اس رشتے میں باندھ بھی دیتے، تب بھی وہ ہنی کو اسے بہ خوبی نبھانے پہ مجبور تو نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اگر دوسری طرف وہ ابراہیم ملک کو اس زبردستی سے روک دیتیں۔ تو اپنی بہن کو کیا جواب دیتیں۔ وہ مہر کو حنان نامی عفریت سے کیسے بچاتیں؟

"میری یہی شرط ہے تموز۔" اس کے چہرے پہ نگاہ جمائے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات دہرائی تو تموز کی مٹھیاں مارے اشتعال کے سختی سے بھنچ گئیں۔ وہ چند لمحے انہیں سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔

اس کے تیور ابراہیم صاحب کو رتی برابر متاثر نہ کر پائے تھے۔ لیکن انجم بیگم کے لیے اس پریشانی سے نکلنا ناممکن تھا۔ وہ بے بسی سے اپنا سر تھام کے بیٹھ گئی تھیں۔

✡ ✡ ✡

مہر، جاشی کی فرمائش پہ اپنا اور اس کا چائے کا مگ ٹرے میں رکھے چھت پہ آئی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نظر جاشی کے ساتھ کھڑے تموز سے ٹکرائی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"لیجیے آگئیں آپ کی منکوحہ صاحبہ!" ایک نظر مہر پہ ڈالتی وہ تموز کی طرف دیکھ کے شرارت سے مسکرائی تھی۔ "اب آپ دونوں جتنی چاہیں باتیں کریں۔ میں چلتی ہوں۔" وہ پلٹ کر مہر کو دیکھتی معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ اور جھپاک سے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

اس کے یوں دغا دے جانے پر، مہر نے پلٹ کر سامنے دیکھا تھا اور تموز کو اپنی جانب پوری طرح متوجہ پا کے اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ وہ نگاہیں چرائے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"چائے۔" اس نے ٹرے آگے بڑھائی تو تموز نے خاموشی سے مگ تھام لیا تھا۔ اس کی نظریں مہر سے ہٹ کر دور تک پھیلی روشنیوں پہ جا ٹھہری تھیں۔ وہ اپنا مگ لیے اس سے قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

"مہر!" اور مہر کو لگا تھا جیسے اس کی پوری جان اس ایک لفظ میں سمٹ آئی ہو۔ تموز کے منہ سے اپنا نام اسے کچھ ایسا ہی معتبر کر گیا تھا۔

"تم یہ روشنیاں دیکھ رہی ہو۔" اس نے مہر کی

طرف دیکھے بنا انگلی سے اشارہ کیا تو مہر بے اختیار اپنے سامنے پھیلی ان روشنیوں کو دیکھنے لگی۔

"جی۔"

"کیسی لگ رہی ہیں یہ؟" اس نے رسان سے سوال کیا تو مہر ایک پل کو الجھ سی گئی۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" اس نے گردن موڑ کر ایک نظر ثمروز پہ ڈالی جواب بھی نظریں سامنے جمائے ہوئے تھا۔

"اب اگر تمہیں کہا جائے کہ انہیں چھوڑ کر ایک اندھیری بند گلی میں جا کھڑی ہو تو؟" اس نے اچانک رخ موڑتے ہوئے مہر کی آنکھوں میں جھانکا تو حیرت زدہ سی مہر خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"تمہارا ساتھ میرے لیے ایک ایسی ہی اندھیری گلی ہے مہر۔ جس میں 'میں خود کو ساری عمر کے لیے بند نہیں کر سکتا۔" اس کے چہرے پہ نظریں جمائے وہ سکون سے بولا تھا۔ اور مہر کو لگا تھا جیسے کوئی سنسناتا ہوا تیر اس کے سینے میں اتر گیا ہو۔ وہ نا سمجھی کے عالم میں کھڑی اسے دیکھنے لگی تھی۔

یہ 'یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟

"اتنے سالوں میں 'میں نے اپنے ماں باپ 'تمہارے ماں باپ۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی اپنے ہر ہر عمل سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مجھے تم میں یا اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر کوئی یہ بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔" اس نے کندھوں کو اچکاتے ہوئے ساکت کھڑی مہر کو دیکھا تھا۔ "اب تم ہی بتاؤ محبت کے بغیر کیا ہم اس شادی کو....."

"میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں ہنی۔" اس پہ نگاہیں جمائے وہ بہت اچانک اور بہت دھیرے سے بولی تھی۔ اتنی اچانک کہ سامنے کھڑا ثمروز اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا تھا۔

"میں آپ کے علاوہ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" اور ثمروز کو لگا تھا جیسے اس کی گردن میں پڑا پھندا کسی نے مزید کس دیا ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

"سوری ٹو سے مہر۔ لیکن یہ میرا ہیڈیک (دردسر) نہیں۔" بے چینی سے سامنے تکتے ہوئے وہ دھیمے لیکن سرد لہجے میں بولا تو مہر کے بے وزن وجود کو ایک دھچکا سا لگا۔

"ہیڈیک! تو کیا وہ ہیڈیک تھی؟" اس کی خالی نگاہیں ثمروز کے چہرے پر آٹھہری تھیں۔ ثمروز نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے بے اختیار اک گہری سانس لی۔

"دیکھو مہر! تم ایک پڑھی لکھی 'خوب صورت لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے تمہارے لیے اچھے لڑکوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔" وہ اس کی طرف پلٹا تو مہر کی بے جان آنکھیں اس کے بے تاثر چہرے کو ٹٹولنے لگیں۔۔۔ کہیں کوئی ملال 'کوئی رحم 'کوئی احساس۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"وہ اچھا لڑکا آپ کیوں نہیں ہو سکتے ہنی؟" اس نے دل گرفتی سے سوال کیا تو ثمروز جھنجلا سا گیا۔

"نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکا میں نہیں ہو سکتا مہر!" وہ چڑ کر غصے سے بولا۔ مہر اپنے سائیں سائیں کرتے وجود کے ساتھ خاموش ہو گئی۔

"پلیز مہر! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر بابا اس رشتے کی وجہ سے ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ تم پلیز میرے ساتھ چل کر یہ کہہ دو کہ تمہیں بھی یہ رشتہ قبول نہیں۔ پلیز مہر!"

ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے مہر کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کا لمس مہر کے اندر حشر برپا کرنے لگا تھا۔ کوئی اتنا ظالم 'اتنا شقی کیسے ہو سکتا ہے.... وہ مہر احمد کی جان اپنے ہاتھوں میں سمیٹے کھڑا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا کہ اپنی مٹھی کھول دے؟

"اور.... اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟" مہر کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ جن کے عکس میں ثمروز ابراہیم کے گال کا وہ دلفریب تل بھی ڈولنے لگا تھا۔

"تو یاد رکھنا تمہیں بھی میری ذات سے کبھی کوئی

خوشی نہیں ملے گی!" اس نے مہر کا ہاتھ جھٹکنے میں لمحہ نہیں لگایا تھا۔ بے اختیار مہر کی نظریں اپنے خالی ہاتھ پر آٹھہری تھیں۔ وہ اتنی بے وقعت نہ تھی۔ اس درجہ تحقیر کے بعد تو وہ اپنی محبت کا خود آگے بڑھ کر گلا گھونٹ دیتی مگر تموز ابراہیم کے گلے کا طوق کبھی نہ بنتی۔ مگر وہ اس ذلت کا کیا کرتی جو حنان قاضی اس کے ماتھے پہ سجانے کے لیے بے چین تھا۔

"ٹھیک ہے۔ نہ دیجئے گا کوئی خوشی۔" دھیرے سے بولتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں تموز کے چہرے پہ جما دی تھیں۔ جو اس کا فیصلہ سن کے ایک پل کے لیے ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن محض ایک پل کے لیے۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ مارے اشتعال کے تیزی سے سرخ ہو گیا تھا۔

"میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں مہر احمد! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو میں تمہاری ذات کو تماشا بنا کے رکھ دوں گا!" اس کے لہجے کی ٹھنڈک اور آنکھوں کی نفرت اس بات کی گواہ تھی کہ وہ ایسا ہی کرنے والا تھا۔ مگر۔۔۔

"آپ کی راہ میں کھڑی رہوں یا راستے سے ہٹ جاؤں۔

دونوں صورتوں میں میرا ہی تماشا بننے والا ہے۔ سو کوئی بات نہیں۔" مہر زخم خوردہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بوجھل لہجے میں بولی تو تموز نے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مگ پوری طاقت سے زمین پہ دے مارا۔ گرم چائے مہر کے پیروں کو جلاتی اس کے کپڑوں کو داغ دار کرتی چلی گئی تھی۔ وہ سہمی سی بے اختیار کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔ مگر تموز کی بے رحم گرفت نے اسے ایک ہی جھٹکے میں اس کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

"تم دیکھنا مہر احمد' اب تمہارا میں کیا حشر کروں گا!" اس کی متوحش آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اس بے دردی سے مہر کا بازو جھٹکا تھا کہ وہ بے اختیار کراہ اٹھی تھی۔ مگر وہ اس پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا' کرچیوں کو اپنے جوتوں تلے روندتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی مہر کی ہمت' اس کا حوصلہ دونوں جواب دے گئے تھے۔ وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ سالوں کی محبت' برسوں کا انتظار سب ایک ہی جھٹکے میں خاک ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دنوں میں ابراہیم صاحب کی خواہش پر ان کی فیملی صغیر قاضی کے دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث سبھی مل کر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مہر پہ کیا گزری تھی اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے انکار کے بعد سیم کی گلو خلاصی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن یا تو گھر سے باہر گزارتا یا پھر اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا۔ اس نے ماں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اسے کسی بھی معاملے میں شامل نہ کیا جائے۔ وہ مارک سے مسلسل رابطے میں تھا مگر سوزی کو اس نے اس ساری بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

دوسری طرف حنان کے لیے مہر کو کسی اور کا ہوتا دیکھنا ناممکن تھا۔ اس نے مہر کی صورت میں اپنی محبت نہیں بلکہ اپنی ضد ہاری تھی اور اس احساس نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس حد تک کہ وہ شادی سے تین دن پہلے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے دوستوں کے ساتھ اسلام آباد نکل گیا تھا۔

اس کی اس حرکت نے صغیر صاحب کو شدید غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اس اہم موقعے پہ حنان کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ انہوں نے فون پر اسے بے نقط سنائی تھیں۔ مگر حاصل کچھ نہ ہوا تھا۔ اس نے نہ آنا تھا اور نہ وہ آیا تھا۔ البتہ زیب اس کے جانے سے یک لخت ہر فکر' ہر غم سے آزاد ہو گئی تھیں۔ وہ بھرپور خوشی اور مکمل یکسوئی سے اپنی بچی کی رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

حنان کے جانے کے اگلے روز سب نے مل کر مہر کو مایوں بٹھا دیا تھا۔ اس کے آنسو' اس کی اداسی کو سب

ہی نے آنے والے وقت سے منسوب کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ پہنچا تھا۔ جس کا سب ہی کو بے چینی سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

"ثموز تیار ہو گیا؟" ابراہیم صاحب نے ہینگر پر سے کوٹ اتارتے ہوئے ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جو رات کے پونے سات بجا رہی تھی۔ مہمانوں کو آٹھ ساڑھے آٹھ کا ٹائم دیا گیا تھا۔ سارے خاندان والے ان کے ہاں جمع ہونے والے تھے۔ جس کے بعد سب نے سہرا بندی کی رسم ادا کر کے دولہا کے ہمراہ بارات کی صورت ہوٹل پہنچنا تھا۔ جہاں صغیر قاضی نے بہت بڑے فنکشن کا اہتمام کر رکھا تھا۔

"مجھے نہیں پتا آپ جا کے دیکھ لیں۔" انجم نے اپنا گلوبند پہنتے ہوئے مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا۔ ابراہیم صاحب اپنا کوٹ پہن کر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ ان کا رخ ثموز کے کمرے کی طرف تھا۔ لیکن جونہی وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئے بے اختیار چونک گئے تھے۔

ثموز بنا کسی تیاری کے، راکنگ چیئر پہ بیٹھا اسموکنگ میں مصروف تھا۔ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا حلیہ خاصا رف ہو رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے رخ موڑ کے ایک نظر آنے والے پر ڈالی تھی اور پھر بے نیازی سے اپنے شغل میں مصروف ہو گیا تھا۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے؟" اس کی یہ بد تمیزی ابراہیم صاحب کو سلگانے کے لیے کافی تھی۔

"کس لیے؟" اس نے سیدھے ہونے کی زحمت کیے بغیر باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"ثموز!" ان کی پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے تھے۔

"آج نہیں بابا! آج یہ رعب نہیں چلے گا آپ کا۔" وہ پرسکون انداز میں کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "آج آپ کو وہی کرنا پڑے گا جو میں چاہوں گا۔"

"اور تم کیا چاہتے ہو؟" ابراہیم ملک نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"آج میں آپ کی لاڈلی کی بارات لے کر تب ہی جاؤں گا، جب آپ تین دن کے اندر اندر یہ دولت جائیداد سب کچھ میرے نام کر دیں گے۔" ان پر نگاہ جمائے وہ بولا تو ابراہیم صاحب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"واہ! بڑی جلدی قلعی اتار دی بیٹا۔"

"اب تو اتر گئی بابا۔ اب کیا 'کیا جا سکتا ہے۔" انہیں دیکھتے ہوئے اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ کمرے میں لحظہ بھر کو خاموشی چھا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تین دن کے اندر اندر تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ رسان سے بولے تو ثموز ان کے یوں آسانی سے مان جانے پر متعجب سا ہو گیا۔

"اس کی گارنٹی کیا ہے؟" اس کی آنکھوں میں پھیلا شک ابراہیم ملک کے لبوں پہ زخم خوردہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔

"یہ ابراہیم ملک کی زبان ہے بیٹا! کسی دغاباز سیم کی نہیں۔" اور ثموز اس چوٹ پہ لب بھینچ گیا تھا۔

"اب تیاری پکڑو۔ مہمان پہنچنے والے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں کہتے باہر نکل گئے تھے اور ثموز کی آنکھوں کے سامنے مہر کا چہرہ آ ٹھہرا تھا۔

"مہر احمد! تم بھی اب تیاری پکڑو۔ میں پہنچنے والا ہوں۔" وہ تصور میں مہر کو لا کر وہ زہر خند سا بڑبڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

بارات کا استقبال بڑی خوشیوں سے کیا گیا تھا۔ ثموز آف وائٹ شیروانی اور ہلکے سنہری صافے میں اتنا وجیہہ لگ رہا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار مہر کی قسمت پہ رشک کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب بڑوں کی خواہش پر نکاح کی سنت کو ایک بار پھر ادا کیا گیا تھا اور ایجاب و قبول کے مرحلے کے بعد ہلکے سنہری

شرارے میں ملبوس مہر کو ثموز کے پہلو میں لا بٹھایا گیا تھا۔ دونوں کی جوڑی نے صحیح معنوں میں اسٹیج پر سنہری روشنی بکھیر دی تھی۔ اس موقعے پہ اپنی مرحومہ والدہ کو یاد کر کے انجم اور زیب کی آنکھیں بے اختیار بھر آئی تھیں۔

بالآخر یہ خوب صورت تقریب بھی اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔ آنسوؤں' دعاؤں اور قرآن پاک کے سائے تلے مہر رخصت ہو کے ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ جہاں کوئی روپہلا خواب اس کے ہمراہ نہ تھا۔

رسموں کی ادائیگی کے بعد انجم' مہر کو اس کمرے میں لے کر آئی تھیں' جو انہوں نے ڈیکوریٹر سے خاص طور پہ سیٹ کروایا تھا۔ وگرنہ جو کمرہ ثموز کے زیر استعمال تھا۔ اسے تو اس نے کسی کو ہاتھ بھی لگانے نہ دیا تھا۔ کمرے کی آرائش تازہ پھولوں' ربن اور موم بتیوں سے کی گئی تھی' جو سارے ماحول کو بے حد فسوں خیز بنا رہی تھی۔ اتنی محنت' اتنی خوب صورتی مہر کے دل کو مزید رنجیدہ کر گئی تھی۔

"مہو میری جان! تم اس گھر میں بہو نہیں بیٹی بن کر آئی ہو۔ آج سے ہم تمہارے ماں باپ پہلے ہیں اور ہنی کے بعد میں۔ تمہارے حق میں اگر اس سے ذرا سی بھی کوتاہی ہو تو تم بلا جھجک ہم سے کہہ سکتی ہو۔ خود کو یہاں کبھی اکیلا مت تصور کرنا میری جان!" آنے والے لمحوں کا خوف انجم کے دل میں گرہیں سی باندھ رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار مہر کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

"پتا نہیں یہ لڑکا اس معصوم کے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہے؟" پریشانی سے سوچتے ہوئے انہوں نے مہر کے بہتے اشک صاف کیے تھے اور اندیشوں میں ڈوبی باہر نکل آئی تھیں۔ لیکن لاؤنج میں سیم کو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ٹی وی کے آگے بیٹھا کر وہ اپنی جگہ پہ رک گئی تھیں۔

"تم نے چینج کیوں کر لیا ہنی؟" ان کی آواز پہ سیم نے اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ فارغ ہو گئیں؟" ان کی بات کا جواب دیے بنا اس نے بے تاثر لہجے میں سوال کیا تو انجم ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں۔

"ہاں۔ لیکن تم...." انجم بیگم کی بات ابھی منہ میں تھی کہ وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے جاتا دیکھ کر وہ بے چین سی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔

"ہنی! بات سنو بیٹا۔" اور ثموز کی بدلحاظی عود کر آئی تھی۔

"کیا بات ہے مام! کیوں پریشان کر رہی ہیں مجھے؟" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولا تھا۔ مگر انجم اس کی اس بدتمیزی کو مکمل طور پہ نظرانداز کیے بے حد نرمی سے بولی تھیں۔

"دیکھو بیٹا۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں مہر کا کوئی قصور"

"بس!" اس کے اچانک ہاتھ اٹھا کر ٹوکنے پہ انجم ساکت رہ گئی تھیں۔ "آپ کا کام یہیں تک تھا مام! اب میں جانوں اور میری بیوی۔ گڈ نائٹ!"

سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کر تا وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اور انجم اس کی پشت کو بے یقین نظروں سے دیکھتی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

انجم بیگم کے کمرے سے نکلنے پہ مہر نے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور پھر ہنی کی آمد سے پہلے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے ارادے سے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب اسے مہر کی ذات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی تو اس ہار سنگھار کو قائم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے ابھی دو پنیں بھی نہیں اتاری تھیں کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور اگلے ہی لمحے ثموز اندر داخل ہوا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں اور مہر کا دل اچھل کے حلق میں آگیا تھا۔ اسے گھر کے حلیے میں دیکھ کر مہر کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ ثموز نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تھا اور مہر کی جانب رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی

نگاہیں مہر کو اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ جھجک کر نظریں چراتی چہرہ جھکا گئی تھی۔ دلہن کے روپ میں اس کا حسن دو آتشہ ہو رہا تھا۔ مگر افسوس دیکھنے والی کی نگاہ میں دور تک ستائش نہ تھی۔

"آپ میری طرف سے آزاد ہیں ہنی۔ آپ جب چاہیں اپنی محبت کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتے ہیں۔" اس کی بوجھل آواز کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑنے کا سبب بنی تھی۔ سیم نے چونک کر استہزائیہ نظروں سے سر تاپا اسے دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے؟ ہم دونوں وہاں ساتھ رہتے ہیں مہر احمد!" اور مہر کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے یقین نظروں سے ثموز کی جانب دیکھا تھا جو دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟ اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟ ارے بھئی محبت ہوں تمہاری۔ بلکہ صرف محبت ہی نہیں شوہر بھی ہوں تمہارا۔ کیا ہوا جو عورتوں کا شوق ہے مجھے۔ اور کیا ہوا جو میں — پیے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ... آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔" مہر کی کانپتی آواز اس کے جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ سیم نے ایک مسکراتی نظر اس کی اڑی ہوئی رنگت پہ ڈالی تھی اور اپنی جیب میں رکھا موبائل نکال کر اس میں موجود تصویریں کھولنے لگا تھا۔

"لو دیکھو۔" اس نے موبائل مہر کی جانب اچھال دیا تھا۔

لرزتے ہاتھوں سے موبائل تھامے مہر نے اسکرین کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ وہ سیم اور سوزی کی ساحل سمندر کی تصویر تھی۔ بے اختیار ہی مہر کی انگلی اسکرین پہ پھری تھی اور ساتھ ہی منظر بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ سیم اور سوزی کی نائٹ کلب میں لی گئی تصویر تھی۔ جس میں دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے مشروب کے گلاس صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے تصویریں بدلتی گئی تھیں۔ اور مہر مارے وحشت کے پلکیں تک جھپکنا بھول گئی تھی۔ یہاں تک کہ مزید کچھ دیکھنے کا یارا نہ رہا اور موبائل اس کے بے جان ہاتھوں سے چھوٹ کر کارپٹ پہ جا گرا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟" سیم کے مسکرا کر پوچھنے پہ مہر کی روئی ہوئی آنکھیں اس کے وجیہہ چہرے پر موجود دل پہ آٹھہری تھیں۔

"میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا ہنی اور آپ کیا نکلے؟" اپنے حنائی ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ سسک اٹھی تھی۔

"اوں ہوں مہر احمد! رات کا مزہ مت خراب کرو۔ مجھے روتی ہوئی عورتیں بالکل پسند نہیں۔" ثموز نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا اور مہر کے پورے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی۔

"پلیز ہنی! میرے قریب آنے کی کوشش مت کیجئے گا!" اس کی برستی آنکھوں میں درد اپنے عروج پر تھا۔

"کیوں نہ آؤں قریب؟ بیوی ہو تم میری اور بیوی بھی وہ جو میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ یہ خوابناک رات، مہکتا ماحول سب کچھ تمہارے خوابوں کے عین مطابق تو ہے۔" وہ سرد مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کی طرف بڑھا تھا۔ بے اختیار روتی ہوئی مہر نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ کون سا وقت تھا جب وہ اس شخص سے اظہار محبت کر بیٹھی تھی۔

"پلیز ہنی! میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گی۔ مجھے صرف آپ کا نام چاہیے۔" ملتجی انداز میں کہتے ہوئے اس نے سیم کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"نہیں مہر احمد اب نہیں!" سیم کی آنکھوں سے مارے نفرت کے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے

اس نے اس کے پہلو سے نکل جانا چاہا۔ سیم بجلی کی سی تیزی سے پلٹا تھا اور پلک جھپکنے میں مہر کی کلائی سیم کی مضبوط گرفت میں آگئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے مہر کو بیڈ پہ دھکا دیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا تم سے۔ میری ذات سے تمہیں کوئی خوشی نہیں ملے گی۔" سیم نے بے رحمی سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

سنو!

تم جانتے ہو کیا

رات بہت چپکے سے وہ دم توڑ گیا

جو اعتبار مجھے تم پر تھا!

کمرے کی ساکت فضا میں اس کی سسکیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی تھیں۔ مگر انہیں سننے والا واحد انسان بیڈ پہ بہت گہری اور پرسکون نیند سو رہا تھا۔

اسے کوئی چیز تڑپا رہی تھی تو وہ اس اعتبار کا بکھرنا تھا جو اس نے آنکھیں بند کر کے سالہا سال تموز ابراہیم پہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تموز کے ساتھ زبردستی رشتہ جوڑ کے وہ اپنے حق میں ایک برا فیصلہ لے چکی تھی۔ اسے تموز سے کسی اچھائی کی امید نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے ساتھ حنان سے بھی بدتر سلوک کرنے والا تھا۔ ایسا تو اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

عورتوں کے ساتھ اس کی بدکرداری کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مہر کو لگا تھا۔ جیسے اس کا اپنا کردار بے مول ہو گیا ہو۔ وہ صحیح معنوں میں آج تہی دامن ہو گئی تھی۔ اس کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔

اس کا دل شدت سے خود کو ختم کرنے لینے کا خواہش مند تھا۔ ہر دور میں دوغلی زندگی جیتے جیتے وہ اپنے وجود سے بے زار آگئی تھی۔ اب ایک بار پھر بہت سی مشکلیں اس کا دامن تھامے کھڑی تھیں۔۔۔ ماں کا اطمینان، ساس سسر کی خوشی، پیچھے حنان، آگے تموز کی نفرت سے بھری زندگی۔ وہ جاتی تو کہاں جاتی؟ کسے پکارتی؟ دور تک کوئی راستہ نہ تھا۔ سوائے اپنے فیصلے کو نبھانے کے اور مہر احمد نے ایک بار پھر خود کو خاموشی کی سولی پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ بے حد رونق تھی۔ جاشی اور نوریہ بہن بہنوئی کا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ایسے میں زیب اور صغیر قاضی کو انجم نے بے حد اصرار کر کے خود مدعو کیا تھا۔

مہر کے لبوں کی مسکراہٹ اور چہرے کے اطمینان نے انجم کے دل سے ہر خدشے کو دور کر دیا تھا۔ اس پہ مستزاد سیم کا مطمئن انداز انجم نے اس ایک ہفتے میں پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا۔ زیب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ بیٹی اور داماد کو ایک ساتھ دیکھ کر اندر تک سرشار ہو گئی تھیں۔

ناشتے کے بعد مہر نے قصداً "بہنوں کو روک لیا تھا۔ تموز بھی اس ڈرامے سے اکتا کر گاڑی لے کر نکل گیا تھا۔ ولیمہ کی تقریب چونکہ شام کی تھی۔ اس لیے تین بجے کے قریب مہر، جاشی اور نوریہ کے ہمراہ پارلر چلی گئی تھی۔ جہاں سے اس کی واپسی سیدھا ہال میں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مارک نے مسلسل سیم کی فون پہ جان کھائی ہوئی تھی۔ اس کے اصرار پہ بالآخر سیم نے اسٹیج پہ دلہن بنی بیٹھی مہر کی کتنی ہی تصویریں کھینچ کے اسے بھیج دی تھیں۔

"واہ یار یہ لڑکی ہے یا کوئی پری؟" مارک کا تبصرہ پڑھ کے سیم مسکرا دیا تھا۔

"ہاں پری۔۔۔ جو میری جان کا عذاب بن گئی ہے۔"

"اف! کتنے بدذوق آدمی ہو یار۔ میں تو کہتا ہوں گولی مارو اس سوزی کو اور اس حسین مورت کے ساتھ عیش کی زندگی گزارو۔" مارک کا جواب سیم کے چہرے پہ استہزائیہ رنگ بکھیر گیا تھا۔

"کاش کہ میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔"

"پلیز سیم! میں تمہیں صحیح اور مکمل سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں۔ جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ ایسا

نہ ہو کہ کل کو تمہیں پچھتانا پڑے۔" اس کا میسج پڑھ کے سیم بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"سیم اپنے فیصلوں پہ کبھی نہیں پچھتاتا۔ یہ بات یاد رکھنا تم!" اور مارک "جیسے تمہاری مرضی" کہہ کے خاموش ہو گیا تھا۔

ولیمہ کے اختتام پہ زیب' رسم کے مطابق مہر کو "قاضی ولا" لے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اچھا آپا! اب ہمیں اجازت دیں۔" وہ بہن کے پاس چلی آئی تھیں۔ انجم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے' مہر کو آگے بڑھ کے خود سے لگا لیا تھا۔

"خیر سے جاؤ۔" ان کی بات نے صغیر صاحب کے ساتھ بات کرتے سیم کے کان کھڑے کر دیے تھے۔ وہ ان سے معذرت کرتا ماں کی طرف چلا آیا تھا۔

"یہ کہاں جا رہی ہے؟" اس نے مہر کو دیکھا تو وہ بے اختیار نظریں جھکا گئی تھی۔

"یہ آج رات زیب کی طرف رہے گی۔ پھر ہم کل اسے لینے جائیں گے۔" انجم نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"سوری خالہ! میں اپنی دلہن کو کہیں نہیں جانے دینے والا۔" وہ مسکراتا ہوا مہر کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تو دونوں خواتین اس کی اس بے باکی پہ بے اختیار ہنس پڑی تھیں۔ جبکہ مہر کا بے جان دل اس مصنوعی اظہار محبت پہ نئے سرے سے لرز گیا تھا۔ غیر ارادی طور پہ ہی اس نے ذرا سا کھسک کر دور ہٹنا چاہا تھا۔ مگر سیم نے اچانک اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ مہر کی ٹانگیں مارے خوف کے کانپنے لگی تھیں۔

"ہنی! یہ رسم ہوتی ہے بیٹا۔" زیب مسکرا کر گویا ہوئی تھیں۔

"اچھی بے ہودہ رسم ہے کہ نئے کپل کو الگ کر دینا۔" اور زیب خفت زدہ سی ہنس پڑی تھیں۔

"اف توبہ۔ یہ لڑکا تو بالکل ہی امریکن ہو گیا ہے۔" انہوں نے بہن کی طرف دیکھا تو انجم' جو خود بھی ثموز کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کے اندر ہی اندر بے حد حیران تھیں۔ خوشی سے مسکرا دیں۔

"چلو رہنے دو زیب۔" اور زیب مزید کیا کہتیں انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹی اور بھانجے کو گلے سے لگایا تھا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی واپس ہو لی تھیں۔ سب کے ادھر ادھر ہوتے ہی سیم نے ایک جھٹکے سے مہر کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔

"کیوں ڈارلنگ! ابھی سے فرار کی خواہش مند ہونے لگیں؟" اور مہر کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"آئندہ اگر میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانے کی جرات کی نا تو ٹانگیں توڑ کے رکھ دوں گا مہر احمد!"

اس کی سنہری آنکھوں سے نکلتے شعلے مہر کے پورے وجود کو جلا کر خاکستر کر گئے تھے۔ اس جلن' اس اذیت نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتی اس کے ہمراہ اپنی مقتل گاہ کی طرف چل پڑی تھی۔ جہاں ایک اور سیاہ رات اس کا مقدر بننے کو تیار کھڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

تین دن صرف تین دن گزرے تھے۔ مہر احمد کو اپنے ارمانوں کی اس قبر میں دفن ہوئے اور اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس دوغلی زندگی نے محض بہتر گھنٹوں میں اس کے اندر سے یوں جان نچوڑی تھی کہ وہ نڈھال ہی بستر سے جا لگی تھی۔ اس کی طبیعت کی خرابی نے انجم کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ صدقہ خیرات' دعائیں' دوائیں کیا کچھ نہ کر ڈالا تھا انہوں نے تب کہیں جا کر مہر کی طبیعت سنبھلی تھی۔ اس کے منع کرنے پر انجم نے زیب سے مہر کی طبیعت خرابی کا ذکر نہ کیا تھا۔

اس وقت بھی وہ مہر کے سرہانے بیٹھی اپنے ہاتھوں سے اسے یخنی پلا رہی تھیں۔ جب لاؤنج سے اچانک ثموز کے اونچا اونچا بولنے کی آواز نے دونوں کو گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ انجم نے سرعت سے ہاتھ میں پکڑا پیالہ ایک طرف رکھا تھا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بھاگی

تھیں۔ مہر بھی بے اختیاری کے عالم میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تموز کی آواز بتدریج اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ جسے سن کر گھبرائی ہوئی مہر کے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ وہ راہداری عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ لیکن جونہی اس کی نظر ابراہیم ملک کے مقابل انگارے کی طرح دہکتا چہرہ لیے کھڑے تموز پہ پڑی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ تموز اس لب و لہجے میں ابراہیم صاحب سے مخاطب تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی۔ انجم الگ حواس باختہ سی باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھیں۔

"آپ میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کریں گے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔" تموز نے ہاتھ میں پکڑی فائل صوفے پہ پٹخ دی تھی۔ اس فائل میں کیا تھا؟ تموز کس دھوکے کی بات کر رہا تھا؟ وہ دونوں خالہ بھانجی قطعی انجان تھیں۔ "بکواس بند کرو اپنی میں نے تم سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہیں تمہارا حصہ مل جائے گا۔ سو میں نے اپنی بات پوری کی۔ قانونی کارروائی البتہ اب امریکہ میں ہی جا کر ہوگی۔"

"کون سا حصہ؟" تموز بنا کسی لحاظ کے دھاڑا تو ساکت کھڑی مہر نے بے اختیار انجم بیگم کا بازو تھام لیا۔ جن کی اپنی رنگت اڑ گئی تھی۔

"ہر چیز کا آدھا ہے یہ!" اس نے فائل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "باقی کا آدھا کس اولاد کو بانٹ آئے ہیں آپ؟" وہ انتہائی گستاخانہ انداز میں بولا تو مہر کا ہاتھ لپنے — نیم وا لبوں پر آن ٹھہرا۔ یہ تموز ابراہیم کا کون سا روپ تھا؟

"اپنی بیٹی کو دیا ہے میں نے باقی کا حصہ' تاکہ وہ تم سے ذلیل آدمی کے ساتھ گزارا کر سکے!" ابراہیم صاحب اس سے بھی بلند آواز میں دھاڑے تو لاؤنج میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ ساکت کھڑی انجم اور مہر کو بھی معاملے کی تھوڑی بہت سمجھ میں آچکی تھی۔ سو یوں اچانک اپنا حوالہ' وہ بھی جائیداد کے معاملے میں مہر کا چہرہ فق کر گیا تھا۔

"مہر۔ اس مہر احمد کے نام کر دی ہے آپ نے اپنی آدھی جائیداد؟" سیم شاکڈ سا بڑبڑایا تھا۔

"وہ مہر احمد نہیں۔ مہر تموز ہے اب۔" ابراہیم صاحب نے سخت لہجے میں تصحیح کی تھی۔

"مہر تموز۔ مائی فٹ!" اور انجم اپنے لاڈلے کے چہرے پہ چھائی نفرت دیکھ کے حیران پریشان کھڑی رہ گئی تھیں۔ اگر حقیقت یہ تھی تو گزشتہ تین دن سے کیا ہو رہا تھا؟ جبکہ مہر کی اپنا بھرم ٹوٹ جانے پر "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی کیفیت ہو گئی تھی۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ کہ اسے میرے مقابل کھڑا کر کے آپ نے اس کا مستقبل محفوظ کر لیا ہے؟" وہ زہر خند سا ایک قدم آگے آیا تھا۔ "یہ آپ کی بھول ہے مسٹر ملک۔ آپ نے میرا حق اس لاوارث لڑکی کی جھولی میں ڈال کے اس کے مستقبل کا نقشہ بگاڑ دیا ہے۔"

"کیا کرو گے ہاں؟ بولو کیا کرو گے تم؟" ابراہیم ملک نے طیش میں آکر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس ہولناک منظر نے مہر کی چیخ نکال دی تھی۔ جبکہ انجم دیوانہ وار ان دونوں کی جانب لپکی تھیں۔

"خدا کا واسطہ ہے ابراہیم! یہ نہ کریں۔ یہ نہ کریں ابراہیم!" انہوں نے بیٹے کا گریبان باپ کے ہاتھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" وہ باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے' بنا کسی خوف کے بولا تو جہاں مہر کا وجود اس درجہ نفرت کا احساس پا کے نیلا پڑ گیا تھا' وہیں ابراہیم ملک کا ہاتھ اپنی پانچوں انگلیوں کا نشان اس کے چہرے پر ثبت کر گیا تھا۔

"نکلو ابھی نکلو میرے گھر سے خبیث آدمی!" سیم کو دھکیلتے ہوئے ابراہیم صاحب پہ جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش میں انجم ہچک کے رو پڑی تھیں۔ "اور طلاق دے کر جاؤ اسے۔ ابھی اسی وقت طلاق دو!" ان کی دھاڑ نے مہر کی ٹانگوں میں سے جان نکال لی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند دو زانو زمین پہ آگری تھی۔

"طلاق نو وے۔" سیم زہریلی مسکراہٹ لیے پھنکارا تھا۔ "آپ کی اس لاڈلی کو میں کسی صورت طلاق نہیں دوں گا۔ اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" وہ سفاکی کی انتہا پہ تھا۔

"خدا کا خوف کرو تموز۔ اس کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔" انجم روتے ہوئے حلق کے بل چلائی تھیں۔

"آپ لوگوں نے کیا تھا خدا کا خوف، جو میں کروں وہ پلٹ کر ماں پہ گر جاتا تھا۔" یہ آپ کی سگی ہے۔ رہیں اب اس کے ساتھ۔ میری شکل اب آپ لوگ کبھی نہیں دیکھیں گے۔" قطعیت سے کہتا وہ صوفے کی طرف بڑھا تھا۔ فائل اٹھا کر، وہ زمین پہ گری پھوٹ پھوٹ کے روتی ہوئی مہر پہ اک نگاہ غلط ڈالے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا اور اگلے پندرہ منٹ میں وہ اپنا سامان اٹھائے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے تموز! یہ ظلم مت کرو بیٹا! اس معصوم کو اتنی بڑی سزا نہ دو۔" انجم بلکتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی تھیں۔ مگر اس نے تو جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ وہ اپنی ماں کی ہر فریاد، ہر پکار ان سنی کیے تیز قدموں سے دروازہ عبور کر گیا تھا۔ اور پیچھے سسکتی ہوئی انجم دونوں ہاتھوں میں سر تھامے زمین پہ گرتی چلی گئی تھیں۔

★★★

تموز کا جانا ابراہیم ملک کے خاندان کو بے موت مار گیا تھا۔

مہر اور انجم نے کتنے ہی واسطے دے کر ابراہیم صاحب کو ساری حقیقت "قاضی ولا" کے مکینوں پہ کھولنے سے روکا تھا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود ان دونوں کو تموز کی واپسی کا یقین تھا۔

مہر نے زیب تک کو خود پہ گزرنے والی قیامت کی ہوا نہ لگنے دی تھی۔ سب کو تموز کی اچانک واپسی کی وجہ یونیورسٹی سے ضروری کال بتائی گئی تھی۔ اس واقعے کے محض ایک ہفتے بعد ہی ابراہیم صاحب بھی امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ مگر تب تک سیم اپنے ہاتھ لگنے والے آدھے حصے کے لیے قانونی کارروائی شروع کروا چکا تھا۔

اس آڑے وقت میں ابراہیم ملک کے دوست اور پارٹنر، طاہر، نے ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ بذات خود تموز کو سمجھانے اس کے پاس گئے تھے۔ مگر اس نے ان کی بھی ایک نہ سنی تھی۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ اپنا حصہ لے کر سوزی کے پاس نیو ہیون چلا گیا تھا۔ جو تموز کو اس کے وعدے کے مطابق اپنے پاس پا کے اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔

اگلے ایک ماہ میں ابراہیم ملک اپنی باقی ماندہ محنت سمیٹ کے پاکستان چلے آئے تھے۔ ان کی واپسی کے فیصلے کو حالات سے بے خبر "قاضی ولا" کے مکینوں نے بے حد سراہا تھا۔ ان سب کی بے خبری ابراہیم صاحب کو مزید پریشان کر گئی تھی۔ وہ بیوی اور بہو کی اس نادانی بھری روش سے شدید نالاں تھے۔ ان کے نزدیک ان دونوں کا انتظار قطعی لاحاصل تھا۔ لیکن وہ دونوں اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری تھیں۔

دن، ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے تھے۔ ابراہیم صاحب نے پاکستان میں اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کیا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنا گھر بھی خرید لیا تھا۔ اس دوران تموز کی طرف سے مسلسل خاموشی نے زیب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے استفسار، پہ ابراہیم صاحب نے مہر کی ایک نہ چلنے دی تھی اور ساری سچائی زیب کے گوش گزار کر دی تھی۔ حقیقت سن کر زیب تڑپ اٹھی تھیں۔ ان کی بچی پر اتنا کچھ گزر گیا تھا اور انہیں پتا بھی نہ چلا تھا! مہر نے "قاضی ولا" میں اپنی واپسی کے لیے ماں کو صاف منع کر دیا تھا۔ وہ تموز کی بیوی ہو کر اس کا گھر چھوڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مما جان اور بابا نے اس کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے سے منہ موڑ لیا تھا۔ سو وہ ان کی خدمت میں اپنی پوری عمر گزارنے کے لیے تیار تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا۔ ابراہیم صاحب کی زور زبردستی پہ مہر نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جوڑنے کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اس عجیب و غریب

صورت حال نے حنان جیسے زیرک انسان کو بھی چونکا دیا تھا۔ وہ باپ کے ذریعے بالآخر بات کی تہہ تک جا پہنچا تھا۔ یوں مہر احمد کی ناکام ازدواجی زندگی کا بھید سب پہ کھل گیا تھا۔ تموز ابراہیم امریکہ میں کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ کوئی کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر اس نے اپنے کہے کے مطابق مہر احمد کا تماشا بنا کے رکھ دیا تھا۔ اپنا ماسٹرز مکمل کرنے کے بعد مہر نے ایک کالج میں بطور لیکچرار جاب کرلی تھی۔

اس دوران ابراہیم صاحب نے کتنی ہی بار اسے خلع لے کر نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خود کو مہر کی اس بربادی کے لیے قصور وار سمجھتے تھے۔ مگر مہر نے اس معاملے میں انہیں صاف لفظوں میں انکار کردیا تھا۔ اس کا دل تموز کی نفرت کا دکھ جھیل کر اب کسی سے بھی محبت کرنے کے لائق نہ رہا تھا۔ ادھر حنان، مہر کو ایک بار پھر تنہا پا کے میدان میں اتر آیا تھا۔ مگر چونکہ اس بار مہر کے ساتھ زیب اور انجم بھی تھیں۔ اس لیے یہ سب اب حنان کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ بالآخر اپنا مقصد پانے کے لیے اس نے جائشہ کی منگنی کے بعد معاملے کو کچھ اس طور سے ہوا دی تھی کہ مہر کی زندگی کا فیصلہ خود بہ خود حنان کی مرضی کے مطابق ہونے چلا تھا۔ ساتھ ہی اس نے وقت ضائع کیے بغیر صغیر صاحب کے سامنے مہر کے لیے اپنے جذبات کا اظہار بھی کردیا تھا۔

مگر مہر احمد کی سنگین بے ہوشی نے اس کی اور تموز ابراہیم کی علیحدگی کے معاملے کو ایک بار پھر کھٹائی میں ڈال دیا تھا۔ اور حنان سوائے سر پٹخنے کے اور کچھ نہ کرسکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ایکسکیوزمی سر! آپ کو ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔" نرس کے پکارنے پہ راہداری میں بیٹھے ابراہیم صاحب اپنے اندر کھلے سود و زیاں کے ڈھیروں کھاتوں کو سمیٹتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مہر کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اس کی حالت کی طرف سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اسے گھر لے جانے کی اجازت دی تھی۔

اس کی چھٹی کا سن کے صغیر صاحب بھی جاشی اور نوریہ کے ہمراہ اسپتال پہنچ گئے تھے۔ حنان البتہ جھنجلاہٹ کے باعث دوبارہ اسپتال نہیں آیا تھا۔ اسے اس بنے بنائے کھیل کے بگڑ جانے پر شدید غصہ تھا۔ وہ سب مہر کو لے کر ابراہیم صاحب کی طرف چلے آئے تھے۔

"صاحب جی! آپ سے ملنے کے لیے کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔" دل شیر کی اطلاع پر ابراہیم ملک نے کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ جہاں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"اس وقت؟"

"نہیں جی۔ وہ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں۔" اس کی بات پہ انہوں نے ایک تھکی ہوئی سانس لی تھی۔

"کیا نام ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ عجیب مشکل سا نام ہے۔" دل شیر کے جواب پہ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

مہر کو چاروں خواتین احتیاط سے پکڑے آگے بڑھ رہی تھیں لیکن اچانک چلتے چلتے اس کا دل اس تیزی سے ڈوب کر ابھرا تھا کہ اس کے لیے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔

"ہمت کرو میری جان۔" انجم بیگم کی نرم آواز پہ مہر نے اپنا لب کاٹتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔ یہ کیسی بے چینی اس کی رگ و جاں میں سمائی جارہی تھی؟ یوں جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ پریشانی سے سوچتے ہوئے اس نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

"ٹھہرو، میں دروازہ کھولتی ہوں۔" زیب بیگم نے سرعت سے آگے بڑھتے ہوئے داخلی دروازہ وا کردیا تھا۔ جس کے کھلتے ہی وہ سب گویا پتھر کے ہو گئے تھے۔

حیرت کا پہاڑ ٹوٹنا کسے کہتے ہیں۔ یہ ان سب کے چہروں پہ لکھا تھا جو بت بنے، ایک پل کو پلکیں جھپکنا

بھول گئے تھے۔ جبکہ مہر کا ڈوبتا ابھرتا دل یک لخت ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے روم روم میں سما جانے والی بے چینی کا تعلق ثمروز ابراہیم سے تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ان سب کی نگاہیں بیک وقت اس ایک شخص پہ جمی تھیں۔ اور ثمروز کی بے قرار نظروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس چہرے کو اپنی پیاس مٹانے کا ذریعہ بنائے۔ آیا اس ماں کے چہرے کو جو آخری لمحے تک اس کے پیچھے لپکی تھی۔ یا اس باپ کی صورت کو جس کی عزت کو اس نے اپنوں اور غیروں کے درمیان روند کے رکھ دیا تھا۔ یا پھر اس لڑکی کی، جسے تین دن کی سہاگن بنا کے اس نے تین سال کے لیے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ اور وہ نجانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اب تک اس جیسے شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پل کو بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے تو دور انسانیت تک سے نہ دیا تھا۔ جس نے اپنی ہی بیوی کی عزت کو کسی لٹیرے کی طرح پامال کیا تھا۔ اور وہ بدلے میں اس کی عزت کو سنبھالے تاحال اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔

کیا قصور تھا ان تین انسانوں کا؟ یہ کہ وہ اس جیسے خود غرض کی محبت میں مشترکہ طور پر گرفتار تھے۔ اور بس! اور جواباً" اس نے انہیں کیا دیا تھا؟ اس نے ان تینوں کو جوتے کی نوک پہ رکھا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی ماں کی پکار ہوا میں اڑا گیا تھا کہ خدا کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے۔ مگر جب لورین کے جوتے کی نوک نے اس کی پسلیوں میں ضرب لگائی تھی۔ تب اسے درد نہیں بلکہ اس ضرب سے جڑی ذلت کا احساس ہوا تھا۔ اس خدائی پکڑ کا احساس ہوا تھا، جو بنا کسی پیشگی اطلاع کے اس پہ مسلط کر دی گئی تھی۔

مائیکل سے ہونے والی ملاقات نے اس پر اس کی سب سے بڑی غلطی آشکار کر دی تھی۔ اسے سمجھا دیا تھا کہ اپنے پیاروں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں اس نے منہ کی کھائی تھی۔ تب وہ خوفزدہ ہو کے دیوانہ وار بازار کی جانب دوڑا تھا۔ لیپ ٹاپ خرید کے لایا تھا کہ کہیں تو کسی طور وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والے نتیجے کو غلط ثابت کر سکے۔ خود کو یہ باور کروا سکے کہ اس نے اپنے ماں باپ اور مہر احمد کو چھوڑ کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے خود پہ کھلنے والے کسی مدد کے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے بند نہیں کیا تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے لیپ ٹاپ پر اپنا فیس بک اکاؤنٹ سائن ان کیا تھا۔ اور مہر احمد نامی ہر لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ مگر کوئی بھی چہرہ نہیں تھا۔ پھر ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے زندگی میں پہلی بار مہر کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑا تھا۔

"مہر ثمروز۔" لکھ کر اینٹر کرتے ہوئے اس کے دل نے شدت سے دعا کی تھی کہ ایسا کوئی رزلٹ سامنے نہ آئے۔ وہ اسے اگر تین دن کے اندر اندر چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ تو مہر احمد کی محبت کو ہوا ہونے میں زیادہ سے زیادہ تین ہفتے لگے ہوں گے تاکہ اسے اس بات کا تو سکون مل سکے کہ خواب میں دیکھے جانا والا در کم از کم مہر احمد کا ورنہ تھا۔

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے جیت کی نوید نہیں مل تھی۔ مہر ثمروز کے نام سے چند ایک ہی اکاؤنٹ سامنے آئے تھے۔ اور ان میں سب سے اوپر اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ تحیر کے عالم میں وہ کتنی ہی دیر ساکت نظروں سے اپنے سامنے موجود چہرے اور اس کے ساتھ لکھے نام کو دیکھتا رہا تھا۔ اور کتنی ہی دیر بعد اس نے کانپتے ہاتھوں سے اس نام کو کلک کر دیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اسکرین مہر کی چھوٹی سی تصویر کے ساتھ ساتھ انجم بیگم، ابراہیم صاحب، زیب اور صغیر قاضی کی گروپ فوٹو سے بھی روشن ہو گئی تھی۔ ان چاروں کی یہ تصویر اس نے CoverPhoto کے طور پہ سیٹ کر رکھی تھی۔ مارے اذیت کے ثمروز نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ۔ اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا!" اس کی اپنی ہی آواز بازگشت بن کر اس کا غرور پاش پاش کر گئی تھی۔ ایک معمولی انسان ہو

کر اس نے اتنا بڑا بول کیسے بولا تھا؟ اپنی جرات پہ وہ سچ میں دنگ تھا۔ اس نے اس سختی سے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا کہ خون چھلکنے کو بے تاب ہو گیا تھا۔

"اسے میں تب تک اپنے نام کے ساتھ باندھ کے گھسیٹوں گا۔ جب تک کہ اس کی ہڈیاں گل نہیں جاتیں۔" سنسناتا ہوا ایک اور چابک اس کے وجود پہ پڑا تھا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑا تھا۔

اس نے اسی وقت اپنی غلطی سدھارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مارک نے بھی اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اگلے دن وہ ابراہیم صاحب کے دوست، طاہر چوہدری کے پاس چلا آیا تھا۔ ان سے مل کے اسے باپ کے کاروبار کی پاکستان منتقلی سے لے کر وہاں ان کے نئے گھر کے پتے تک ہر بات پتا چل گئی تھی۔ وہ ساری معلومات لیے اپنے دفتر آیا تھا۔ جہاں اس نے اپنے چند اہم ترین کام نبٹائے تھے۔ اور آنے والے چند ہی دنوں میں وہ مارک اور جوزی کی ڈھیروں نیک تمنائیں سمیٹے پاکستان کے لیے فلائی کر گیا تھا۔

اس دوران اس کے قدم کہیں نہ ڈگمگائے تھے۔

اس کا حوصلہ کہیں نہ ٹوٹا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس پل ان سب کو اپنے روبرو پا کے اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

"تم؟؟" ابراہیم ملک ہوش میں میں آنے والے سب سے پہلے فرد تھے۔ وہ چیل کی طرح اڑ کے ثموز پر جھپٹے تھے اشتعال نے ان کا چہرہ انگارے کی طرح دہکا دیا تھا۔ بے اختیار صغیر قاضی انہیں پکڑنے ان کے پیچھے لپکے تھے۔

"بھائی جان۔! سنبھالیں خود کو۔" انہوں نے بامشکل تمام ابراہیم صاحب کو ثموز پر ہاتھ اٹھانے سے روکا تھا۔ جو باپ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کے سر جھکا گیا تھا۔ مگر خود کو ان کے چنگل سے دور رکھنے کے لیے ایک انچ نہ پیچھے ہٹا تھا۔

"چھوڑو مجھے صغیر۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی ہمیں اپنی منحوس صورت دکھانے کی!" ابراہیم صاحب کف اڑاتے، خود کو چھڑانے کی کوشش میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ جبکہ انجم، بے یقینی سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے، بیٹے کو سامنے پا کے بے اختیار رو پڑی تھیں۔ کچھ یہی کیفیت زینب کی بھی تھی۔ وہ حق دق کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھیں۔ مگر مہر کے بکھرے ہوئے اعصاب کے لیے اس بار کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ بے اختیار لڑکھڑائی تھی اور قریبی صوفے پہ ڈھے سی گئی تھی۔

"حوصلے سے کام لیں بھائی جان۔" صغیر صاحب انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آوازیں سن کر ملازمین بھی داخلی دروازے کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے۔

"نہیں ہے میرا حوصلہ۔ کھا لیا ہے اس نے مجھے۔ ختم کر دیا ہے اس نے میرا سب کچھ!" جذبات کی شدت کے باعث ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ان کی تڑپ اور اپنی خطاؤں نے ثموز کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے تھے۔

"بابا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔" وہ ہاتھ جوڑے آگے آیا تھا۔

"مت دو مجھے یہ "بابا" نام کی گالی۔" اس کا انہیں "بابا" پکارنا ابراہیم ملک پہ غضب ڈھا گیا تھا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا۔ اور آن واحد میں ثموز کو اس کے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"مسٹر ملک ہوں میں۔ سنا تم نے مسٹر ملک ہوں میں!" پے در پے انہوں نے تین چار تھپڑ ثموز کے منہ پر مارے تھے۔ ان کی انگوٹھی کی ضرب نے اس کا ہونٹ پھاڑ دیا تھا۔ اس کے چہرے پہ خون ابلتا دیکھ کے سب خواتین کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ انجم تو چکرا کے بہن کے کندھے پہ آ رہی تھیں۔ جبکہ مہر نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے بند کر لی تھیں۔ اس کے چہرے پہ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ اس دشمن

جاں کا یہ حال دیکھنا بھی اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔ اس کی جان تو دہری اذیت میں آ پھنسی تھی۔

"تم ہمارے لیے مر گئے ہو!" اسے کالر سے گھسیٹتے ابراہیم ملک باہر کی طرف بڑھے تھے۔

"خدا کا واسطہ ہے چھوڑ دیں بھائی جان۔" نویرہ اور جائشہ نے تیزی سے انجم بیگم کو سنبھالا تھا اور زیب تڑپ کر بہنوئی کی طرف بھاگی تھیں۔

"بھائی جان! یوں نہ کریں۔" صغیر قاضی نے بھی ان کی راہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ابراہیم صاحب پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے داخلی دروازے تک لائے تھے۔ اور پوری طاقت سے اسے باہر دھکا دے دیا تھا۔ وہ ملازمین کے سامنے منہ کے بل فرش پہ جا گرا تھا۔

دھاڑیں مار مار کر روتی زیب دیوانہ وار تموز کی جانب بڑھی تھیں۔ مگر ابراہیم صاحب کی دھاڑ ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

"کسی نے بھی اگر اسے ہاتھ لگایا تو وہ میرے لیے مر گیا!" ان کی اس تنبیہہ کے بعد ہر کوئی اپنی جگہ پر جامد ہو گیا تھا۔

تموز اپنے منہ اور ناک سے بہتے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتا اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا موبائل جیب سے نکل کے زمین پر گر گیا تھا۔ مگر اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھے اپنا بے وزن وجود لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معاف کر دیں بابا!" اس کی سسکیاں اذیت سے پر تھیں۔

"دل شیر' ریاض اسے لے جا کر گھر سے باہر پھینک دو۔ اور دوبارہ اس شخص کے لیے دروازہ مت کھولنا!" اس کی ہر التجا نظر انداز کیے۔ وہ کڑے لہجے میں ملازمین سے مخاطب ہوئے تھے۔ جو گھبرا کے سرہلاتے آگے بڑھے تھے اور تموز کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زبردستی کی طرف کھینچنے لگے تھے۔

"کہیں نہیں جاؤں گا میں۔ چاہے مجھے باہر پھکوا دیں۔ میں اس در سے کہیں نہیں جاؤں گا۔!" ملازمین کے ساتھ گھسٹتے ہوئے اس کی آہ و فغاں بلند ہوئی تھی۔

مہر نے بے اختیار اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔ اس کے آنسو' اس کی تڑپ زیب کی برداشت سے بھی باہر ہو گئی تھی۔ وہ دوپٹے میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھیں۔ مگر ابراہیم ملک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے تھے۔ وہ تب تک دروازے میں کھڑے رہے تھے' جب تک ملازموں نے تموز کو باہر دھکیل کے گیٹ بند نہ کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے دس بجنے کو تھے۔ مگر ہر ایک صدمے کی کیفیت میں تھا۔ تموز کو گھر سے نکال کے ابراہیم صاحب اپنے کمرے میں بند ہو گئے تھے۔

انجم' غنودگی کی کیفیت میں مہر کے بستر پہ پڑی تھیں۔ لیکن اس حال میں بھی آنسو ان کی بند آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی کنپٹیوں میں جذب ہو رہے تھے۔ اور مہر متورم چہرے کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔ زیب' صغیر صاحب' جاشی' نویرہ سب ہی اس کے پاس موجود تھے۔ مگر اس ہجوم میں بھی وہ بالکل اکیلی تھی۔ تنہا اور بے کراں۔

کتنے ہی منظر' کتنی ہی باتیں ذہن کے پردے پر ابھر اور مٹ رہی تھیں۔ کیا کچھ نہ سہا تھا اس نے۔ کیا کچھ نہ سنا تھا اس نے۔ اپنے شوہر کی بدکرداری۔ اس کی نفرت۔ اس کے ہاتھوں اپنے وجود کی تذلیل' اپنی ذات کی تذلیل۔ اور یہ سب اس نے تنہا برداشت کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج تک اس نے اپنے یہ زخم اپنی ماں کو بھی نہیں دکھائے تھے۔ اس نے اپنے ساس سسر سے بھی تموز کی بدکرداری کا کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ مگر آج جب وہ لوٹ آیا تھا تو دل نیم جاں پر لگا ہر زخم لو دینے لگا تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟

اس کی حدوں کو چھوتی نفرت بھلا یوں اچانک کہاں غائب ہو گئی تھی۔؟ یا پھر یہ تموز ابراہیم کا کوئی نیا سوانگ تھا۔ دولت کے لیے۔ یا اپنی کسی اور غرض کے

لیے۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی بھلا؟ اس نے تو ہمیشہ کی طرح مہر کو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔

"آپ کو پتا ہے بھائی! ثموز بھائی واپس آگئے ہیں۔" جاشی، حنان کو مطلع کرنے کی غرض سے اپنا فون لیے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اور لائن کے دوسری طرف ڈرائیو کرتے حنان پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"کیا؟" گاڑی کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ اس نے سرعت سے اپنے ذہن کو حاضر رکھتے ہوئے گاڑی کو سنبھالا تھا۔

"مگر کب؟ کیسے؟" اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں ونڈ اسکرین پہ مرکوز تھیں۔

جواب میں جاشی نے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بھائی کے گوش گزار کردیا تھا۔ جس نے پریشانی کے عالم میں بے اختیار اپنا سر تھام لیا تھا۔

"یہ کیا ہوگیا حنان قاضی؟" اس نے اضطراب کی کیفیت میں خود سے سوال کیا تھا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" بامشکل تمام خود کو ٹریفک کے دھارے سے الگ کرتے ہوئے اس نے گاڑی ایک طرف روکی تھی۔

"باہر ہی بیٹھے ہیں۔" اور حنان نے ناقابل یقین انداز میں اک گہری سانس لیتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"آپ آئیں گے یہاں؟" جاشی کے سوال پہ وہ بھنا اٹھا تھا۔

"میرا کیا کام ہے وہاں۔ جو مرضی کریں یہ لوگ۔" اس کے تلخ لہجے پہ جاشی نے مزید کچھ کہے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

حنان نے ہاتھ میں پکڑا فون ایک طرف پٹختے ہوئے بے اختیار اسٹیرنگ پر ہاتھ دے مارا تھا۔ "او گاڈ!!" باآواز بلند اپنا غصہ نکالتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ لیے تھے۔ یہ کیا ہوگیا تھا؟ یہ ثموز ابراہیم کیسے لوٹ آیا تھا؟ وحشت سے سوچتے ہوئے اس نے بے چینی سے اپنی پیشانی مسلی تھی۔

"کیا کروں؟ کیا کروں؟" اضطراب کے عالم میں بند مٹھی لبوں پہ جمائے اس نے جلد از جلد ثموز ابراہیم سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ سوچنا چاہا تھا۔ اور تب ہی بالکل اچانک ایک بہت عجیب حل اسے سوجھ گیا تھا۔

"ہاں! زبردست۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے دوسری سیٹ پہ پڑا فون جلدی سے اٹھایا تھا۔ اس کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی انگلیاں اپنے خاص دوست کا نمبر ملانے لگی تھیں۔ جو کہ ایک بااثر سیاسی شخصیت تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو فیض!" دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی وہ بے چینی سے بولا تھا۔

"ہاں حنان! کیسے یاد کیا؟" اس کی بھاری آواز خوشگوار تھی۔

"مجھے تیری مدد کی اشد ضرورت ہے فیض!" وہ سیدھا مدعا پہ آیا تھا۔

"ہاں بول۔"

"ایک بندے کو اٹھوانا ہے۔ ابھی اسی وقت!" اس کی بات پہ ایک لمحے کو دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہوجائے گا۔" اور حنان کا پریشانی میں ڈوبا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا تھا۔ "کون ہے وہ؟" اس کے استفسار پہ حنان اسے ثموز ابراہیم کے بارے میں آگاہ کرنے لگا تھا۔ ساری بات سن کے فیض نے ہنکارا بھرا تھا۔

"ہوں۔ تو ایسا کر ان کے گھر کے باہر پہنچ کر بندے کی صحیح پوزیشن سے مجھے آگاہ کر۔ میں یہاں سے بندے روانہ کرتا ہوں۔"

"ٹھیک۔ بہت بہت شکریہ فیض! اس کام کے بدلے میں تو جان بھی مانگے گا ناں۔ تو دے دوں گا۔" حنان کی بات پر فیض بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو وہاں پہنچ۔" اور

حنان نے فون بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔

"میں اس بار تمہیں کسی قیمت پر نہیں جیتنے دوں گا ثمروز ابراہیم!" نفرت اور رقابت کی آگ نے اسے سچ میں بالکل اندھا کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ جب صغیر قاضی گھر جانے کے ارادے سے تنہا پورچ میں آئے تھے۔ انہیں باہر آتا دیکھ کے دل شیر تیزی سے ان کی جانب لپکا تھا۔

"صاحب جی! یہ فون شاید اس لڑکے کا ہے۔ یہاں گملے کے پیچھے گرا پتا نہیں کب سے بج رہا تھا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل صغیر صاحب کی طرف بڑھایا تو ان کی نظریں فون پہ آٹھہریں۔ جس کی اسکرین چیخ چکی تھی۔

"جا کر اسے دے آؤ۔"

"گیا تھا۔ مگر وہ اب باہر نہیں ہے۔" دل شیر کی بات پہ انہوں نے فون پکڑ لیا تھا۔ تب ہی اچانک وہ پھر سے بجنے لگا تھا۔ اسکرین پہ کسی مارک کا نام دیکھ کر انہوں نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کال ریسیو کرلی تھی۔

"ہیلو۔ ہیلو سیم! کب سے کال کرتے مارک نے بے چینی سے اسے پکارا تھا۔

"سوری۔ وہ یہاں نہیں ہے۔" صغیر صاحب نے انگلش میں جواب دیا تھا۔ ان کی بات پہ مارک بے اختیار تھم گیا تھا۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں۔" صغیر صاحب ایک پل کو رکے تھے۔

"میں اس کا انکل بات کررہا ہوں۔" ان کے تعارف نے مارک پہ شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری کردی تھی۔

"او گاڈ! تو کیا آپ لوگوں نے اسے معاف کردیا۔ آپ لوگوں کی صلح ہوگئی انکل؟" اور صغیر صاحب اس کی بات پہ ساکت ہوگئے تھے۔

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

"میں اس کا بیسٹ فرینڈ اور پارٹنر مارک بول رہا ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آپ لوگوں کی صلح۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا مسٹر مارک! اس کے والد نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے تو مارک کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا!" اور پھر چند لمحوں کے لیے لائن پہ خاموشی چھا گئی۔

"پلیز انکل۔ میری آپ سے ریکویسٹ ہے۔ اس کے والد کو سمجھائیں کہ اس کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ وہ بہت کڑے اور بُرے حالات سے لوٹ کر آپ لوگوں تک آیا ہے۔" چند لمحوں کے بعد مارک کی بوجھل آواز صغیر صاحب کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بری طرح چونک گئے۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے کھل کر بتائیں گے مسٹر مارک!" ان کی بات پہ مارک نے اک گہری سانس لی تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے وہ ساری بات صغیر قاضی کو بتاتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ثمروز کی جس وقت آنکھ کھلی' ارد گرد گھپ اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ ایک پل کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ کہ آیا وہ اٹھ چکا ہے یا اب بھی سو رہا ہے۔ اس اندھیرے نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ اس نے بے چینی سے اپنے وجود کو جنبش دینا چاہی تھی۔ مگر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی گھبراہٹ یک لخت دو چند ہوگئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہی کسی کو مدد کے لیے پکارا تھا۔ اور تب ایک جھماکے کے ساتھ اس کے ذہن میں وہ منظر تازہ ہوگیا تھا۔ جب گھر کے باہر بیٹھے ہوئے اس کے عین سامنے ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ اور اچانک اس میں سے چند آدمی نکل کر اس کے سر پہ

آکھڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا ان میں سے کسی نے ایک کپڑا اس کی ناک اور منہ پہ جما دیا تھا۔ جس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، مجھے اغوا کرلیا گیا ہے او نو۔" ڈوبتے دل کے ساتھ اس نے متوحش نظروں سے اپنے اردگرد چھائے اندھیرے کو دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اس کی مدد کے لیے چیخ و پکار عروج پہ پہنچ گئی تھی۔ ایسے میں اچانک کسی انجانی سمت سے کنڈی کی آواز اسے بے اختیار خاموش کروا گئی تھی۔ وہ دم سادھے آنے والی آہٹ پہ کان جما گیا تھا۔ تب ہی اس کے داہنی طرف سے دروازہ کھلا تھا اور سوئچ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ روشنی میں نہا گیا تھا۔ روشنی کی چبھن نے ثمروز کو آنکھیں بند کرنے پہ مجبور کردیا تھا۔

"تشریف لائیں سرکار۔" قدموں کی دھمک کے درمیان اسے فرش پہ کرسی گھسیٹنے کی آواز آئی تھی۔ ثمروز نے زبردستی اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے عین سامنے رکھی گئی کرسی پر ایک شخص بڑے کروفر سے ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی کے اردگرد تین اسلحہ بردار آدمی کھڑے تھے۔ وہ چاروں افراد ثمروز کے لیے بالکل انجان تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کی خوف زدہ آنکھیں کرسی پہ بیٹھے فیض کے چہرے پہ آٹھہری تھیں۔ جس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ہم تمہاری بیوی کے باراتی ہیں ثمروز ابراہیم!" اور ثمروز کو زندگی میں پہلی بار مہر کا حوالہ کس دوسرے مرد کے منہ سے سن کر شدید ناگوار گزرا تھا۔

"کیا بک رہے ہو۔" اس کی آنکھوں میں موجود خوف یکایک غصے میں ڈھل گیا تھا۔

"بک نہیں رہا، صحیح کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ تم ابھی اسی وقت اسے طلاق دینے والے ہو۔ یہی تمہاری رہائی کی قیمت ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے فیض نے مونچھوں کو تاؤ دیا تھا اور ثمروز اپنی جگہ پہ ساکت ہو گیا تھا۔

"کس نے رکھی ہے یہ قیمت؟ میرے۔ میرے بابا نے؟" اس کی آواز شدید بے یقینی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ثمروز کی بات فیض کو چونکا گئی تھی۔

"تو کیا تمہارا باپ بھی تمہاری بیوی کی تم سے گلو خلاصی چاہتا ہے؟" وہ محظوظ سا بولا تو ثمروز کے سینے میں اٹکی سانس بحال ہو گئی۔ وگرنہ ابراہیم ملک کی اس درجہ نفرت کا سوچ کر تو اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

"ارے یار، اتنے بُرے شوہر ہو تو جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے اس بے چاری کی؟" فیض کا مسکرا کر کسا گیا جملہ ثمروز کے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔ اور کان کھول کر سُن لو، میں کسی بھی قیمت پر اپنی بیوی کو طلاق نہیں دوں گا۔"

"چاہے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں؟" فیض کے چہرے پہ یک لخت سرد مہری پھیل گئی تھی۔

"بالکل!" ثمروز نے قطعیت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں چند ثانیے کے لیے ایک دوسرے سے بندھی رہی تھیں۔ اور پھر فیض نے رخ اپنے بندوں کی جانب موڑ لیا تھا۔

"چلو پھر تواضع کرو صاحب کی۔" اس کے حکم پہ دو بندے ثمروز کی طرف بڑھے تھے۔ اور اگلے ہی لمحے اس کا وجود ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پہ آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مارک سے ثمروز پہ گزرنے والے حالات کی پوری روداد سن کے صغیر صاحب شل ہو گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر ماؤف ذہن کے ساتھ باہر ٹہلتے رہے تھے۔ اور پھر ایک نتیجے پہ پہنچ کے تیز قدموں سے اندر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ سیدھا ابراہیم صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ کتنی ہی منتوں کے بعد وہ ابراہیم ملک کو ان کے کمرے سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

انہیں اپنے ساتھ لیے وہ مہر کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ جہاں ساری خواتین موجود تھیں۔ سب کی حیرت بھری نظروں کے جواب میں انہوں نے

صرف ثمروز کے موبائل کے ملنے اور اس کے دوست مارک کی کال کے آنے کا ذکر کیا تھا۔ اور پھر انہوں نے مارک کو کال کر کے اسے ثمروز کی فیملی کی اپنے ساتھ موجودگی کے بارے میں بتایا تھا۔ مارک کا نام سن کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔ وہ اسے Yale کے حوالے سے جانتے تھے۔ صغیر صاحب نے اس سے ساری بات نئے سرے سے دہرانے کی درخواست کرتے ہوئے، موبائل کا اسپیکر کھول دیا تھا۔

مارک نے دھیرے دھیرے گزرے تین سالوں کو لفظوں میں ڈھالنا شروع کیا تھا۔ سوزی سے اس کی شادی کا سن کے مہر کی آنکھوں سے آنسو قطروں کی صورت گرنے لگے تھے۔ کچھ یہی کیفیت انجم بیگم کے دل کی بھی تھی۔ انہیں یہاں، سولی پہ لٹکا کے اس نے کتنے آرام سے وہاں اپنی من چاہی دنیا بسالی تھی۔ اس وقت جب مہر یہاں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنی ماں تک سے نجانے کون کون سے جھوٹ بولتی پھر رہی تھی۔ تب وہ وہاں خوشیوں کے ہنڈولے میں اپنی محبت کے ہمراہ جھول رہا تھا۔ ثمروز نے واقعی اپنا کہا نبھایا تھا۔ اس نے دور رہ کر بھی اپنی ذات سے مہر کو کوئی خوشی نہیں ملنے دی تھی۔

لیکن جوں جوں مارک کی گفتگو لورین کی طرف پیش رفت کرتی گئی تھی۔ سب سننے والوں کے رنگ بدلتے چلے گئے تھے۔ اس کا ثمروز کو لوٹنا اور نیم مردہ حالت میں کچرے کے ڈھیر پہ پھینک جانا، سب ہی کی سانس روک گیا تھا۔ یہ احساس کہ وہ رات بھر انتہائی زخمی حالت میں، لاوارثوں کی طرح کوڑے پر پڑا رہا تھا، سب کا دل نچوڑ گیا تھا۔ حتیٰ کہ ابراہیم ملک کا چہرہ بھی مارے ضبط کے سرخ ہو گیا تھا۔ مارک کی اپنی آواز بھی اس وقت کو یاد کر کے بھر آئی تھی۔

اور پھر ثمروز کا خوف، اس کی تڑپ اور اس کا پچھتاوا سن کر تو وہ سب ہی دنگ رہ گئے تھے۔ کیا اس جیسے سنگ دل اور خود پرست آدمی کی کایا پلٹ بھی ممکن تھی؟ یہ اذیت ناک حادثہ ثمروز ابراہیم کے لیے سزا تھی یا رحمت، وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بے شک اللہ کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ وہ کب کسی فاسق کے دل کے بدلنے کا سامان پیدا کردے، کوئی نہیں جانتا۔

"پلیز سر! میری آپ سے درخواست ہے کہ اسے مزید مت آزمائیں۔ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ اس نے اپنے کیے کی سزا بھگت لی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے اسے معاف نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ اپنا بیٹا ہمیشہ کے لیے نہ کھودیں۔" مارک کی بات پہ انجم تڑپ اٹھی تھیں۔

"اللہ نہ کرے۔ خدا نہ کرے!" وہ دوپٹے میں منہ چھپائے زور زور سے رونے لگی تھیں۔ ان کے رونے کی آواز مارک نے بھی سن لی تھی۔ دل گرفتی سے الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے صغیر صاحب نے ایک نظر حاضرین محفل پہ ڈالی تھی۔ اور

اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"میں ثموز کو لے کر آتا ہوں۔" ان کی بات پر سب نے انہیں دیکھا تھا۔ مگر کیا کچھ نہ تھا۔ اور ان کے اطمینان کو یہ خاموشی بہت تھی۔
وہ تیز قدموں سے چلتے باہر آئے تھے۔ اور گیٹ کھول کر انہوں نے ثموز کی تلاش میں اردگرد دیکھا تھا۔ مگر اسے کہیں نہ پاکے وہ ایک بار پھر اندر چلے آئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی کی اطلاع نے سب کو نئی پریشانی میں گرفتار کردیا تھا۔
صغیر صاحب نے ایک بار پھر مارک سے رابطہ کیا تھا۔ اور اس سے ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ جہاں ثموز نے قیام کیا تھا۔
ہوٹل کا پتا لے کر صغیر قاضی، دل شیر کو لے کر نکل گئے تھے۔ اس دوران ابراہیم صاحب نجانے کن سوچوں میں ڈوبے بالکل خاموش بیٹھے رہے تھے۔ مہر بھی بیڈ کی پشت سے سر ٹکائے گم صم سی ہوگئی تھی۔ سب کچھ اتنا اچانک اور اتنا عجب تھا کہ اس کا ذہن یک لخت ایک خالی سلیٹ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اسے آنے والے وقت کے حوالے سے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
ادھر رات کے اس پہر صغیر صاحب کو بہت مشکل سے ہوٹل کے اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ مگر ثموز کو وہاں بھی نہ پاکے صغیر صاحب بری طرح پریشان ہوگئے تھے۔ اسی پریشانی میں وہ واپس ملک صاحب کی طرف آئے تھے۔ ثموز کی ہوٹل سے بھی غیر موجودگی کی خبر نے گھر والوں کو متوحش کردیا تھا۔ انہوں نے اردگرد کا سارا علاقہ چھان مارا تھا، مگر ثموز کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ اسی پریشانی میں رات تمام ہوئی تھی اور اگلا دن نکل آیا تھا۔ مگر یہ دن بھی شدید مایوسی کی نذر ہوا تھا۔ ثموز اچانک کہاں چلا گیا تھا، کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ گھر میں کہرام برپا ہوگیا تھا۔ رات تک ابراہیم ملک کا حوصلہ بھی جواب دے گیا تھا۔ اور بالآخر انہوں نے پولیس سے رابطہ کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حنان ابھی ابھی صغیر قاضی کے ساتھ ابراہیم صاحب کی طرف سے لوٹا تھا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں چلے جانے سے وہ خاصا پریشان ہوگیا تھا۔ گھر پہنچ کر اس نے صغیر صاحب کے اپنے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کیا تھا۔ اور جب ان کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی —— تب وہ لاؤنج سے اٹھ کر دبے قدموں ٹیرس پہ چلا آیا تھا۔
اب اسے اس کی بدقسمتی کہیں یا کچھ اور کہ صغیر صاحب کپڑے تبدیل کرکے، کچھ دیر لان میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے ارادے سے کمرے سے دوبارہ باہر چلے آئے تھے۔ ان کا رخ نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ لیکن اچانک انہیں اردگرد چھائی خاموشی میں ٹیرس کا دروازہ کھلنے اور آہستگی سے بند ہونے کی آواز نے اپنی جگہ پہ رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔ انہوں نے ٹھٹک کر اوپر جاتے زینے کی طرف دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے چیک کرنے کے ارادے سے تیزی سے اوپر کو بڑھ گئے تھے۔
احتیاط سے چھت کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے ٹیرس پہ جھانکا تھا۔ جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے اوپر داخل ہوئے تھے۔ ان کا ہاتھ دروازے کے ساتھ ہی دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ لائٹ جلاتے انہیں پانی کی ٹنکی کے دوسری طرف سے حنان کے بولنے کی آواز آئی تھی اور وہ بری طرح چونک گئے تھے۔
حنان اس وقت یہاں اندھیرے میں کیا کررہا ہے؟ دل میں سوچتے ہوئے وہ اسے دیکھنے کی نیت سے چاند کی روشنی میں ہی آگے بڑھے تھے۔ وہ ٹنکی کے قریب پہنچے تھے کہ دوسری طرف سے حنان کی آواز نے انہیں اپنی جگہ پہ ساکت کردیا تھا۔
"دیکھو فیض! معاملے میں پولیس انوالو ہوگئی ہے۔ تجھے جلد از جلد اس سے دستخط لینے ہوں گے۔" اور صغیر قاضی کی مارے بے یقینی کے سانس رک گئی تھی۔
"کیا حنان، ثموز کے بارے میں بات کررہا تھا؟"

ڈوبتے دل کے ساتھ انہوں نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا تھا۔ جبکہ حنان لحظہ بھر کو رک کے دوسری طرف کی بات سننے لگا تھا۔

"کیا کہا۔ اب بھی نہیں مان رہا؟ اتنی مار پیٹ کے باوجود بھی؟" ثمروز کا تا حال اپنی بات پہ ڈٹے رہنے کی اطلاع نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ "ٹھیک ہے' پھر مارو اس کی ٹانگ میں ایک گولی تاکہ یہ اس طلاق نامے پر دستخط کرے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا تھا اور صغیر صاحب کی آنکھوں کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے تھے۔

یہ کیسا بھیانک انکشاف تھا۔ ثمروز کے غائب ہونے میں ان کے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ بے اختیار ان کے کانوں میں حنان کی آواز گونجنے لگی تھی۔

"میں مہر کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ۔ میں مہر سے محبت کرنے لگا ہوں۔" اور صغیر صاحب نے اپنا چکراتا سر تھام لیا تھا۔

"او خدایا! تو اس لڑکے نے یہ ذلیل حرکت مہر کو حاصل کرنے کے لیے کی ہے؟ یہ ان دونوں میں زبردستی طلاق کروانا چاہتا ہے؟" ان کی رگوں میں خون کی جگہ یکایک لاوا دوڑنے لگا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ اور تیز قدموں سے آگے بڑھے تھے۔

ان کی آمد سے بے خبر حنان' فیض کو ہر حال میں یہ معاملہ کل شام تک نبٹانے کی تاکید کر رہا تھا۔ مگر اپنے پیچھے اچانک قدموں کی دھمک سن کے وہ سرعت سے پلٹا تھا۔ اور باپ کو اپنے روبرو پا کے اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"ذلیل! کمینے!" ان کا ہاتھ اٹھا تھا اور وہ یکے بعد دیگرے دو تین تھپڑ حنان کے منہ پر مارتے چلے گئے۔

"تو میرا بیٹا ہو کر اتنی گری ہوئی حرکت کرے گا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔" حلق کے بل چلاتے ہوئے ان کی آنکھیں مارے غضب کے ابل پڑی تھیں۔ حنان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا تھا۔

صغیر صاحب نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے موبائل پکڑتے ہوئے کان سے لگایا تھا۔ مگر دوسری طرف بھی شاید ان کی آواز سن لی گئی تھی۔ تب ہی کال کاٹ دی گئی تھی۔ انہوں نے ایک خون آشام نگاہ بت بنے حنان پہ ڈالی تھی۔ اور پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ انہیں جاتا دیکھ کر حنان کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ وہ متوحش سا ان کے پیچھے لپکا تھا۔

"ڈیڈی! پلیز ڈیڈی میری بات سنیں!" مگر وہ اس کی پکار نظرانداز کیے قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔ بالآخر حنان کو ہی بھاگ کر ان کی راہ میں آنا پڑا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیرس کی لائٹ جلادی تھی۔ روشنی میں اس کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی صغیر صاحب کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئی تھیں۔

"حنان میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں خود کو ختم کرلوں گا۔" ان کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پر اٹل تھا۔

"پلیز ڈیڈی ایک بار۔ صرف ایک بار میری بات تو سنیں۔" اس کی آواز میں التجا ہی التجا تھی۔

"تمہاری اور میری بات اب صرف اور صرف پولیس کے سامنے ہوگی۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قطعیت سے بولے تو حنان کی روح فنا ہو گئی۔

"پلیز ڈیڈ یہ نہ کیجیے گا۔ میری۔ میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"تو تمہیں ثمروز اور مہر کی زندگی تباہ کرتے شرم نہیں آئی خبیث انسان؟" یک لخت دھاڑتے ہوئے انہوں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ ان کے سوال نے حنان کو نظریں جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"ساری زندگی تم اس بھلی عورت کے صبر کو آزماتے رہے۔ مگر اس نے اپنی ماتا کا ہاتھ تمہارے سر سے نہیں اٹھنے دیا۔ اس معصوم اور یتیم بچی کو اپنی نفرت کی آگ میں جھونکتے رہے مگر اس نے کبھی تمہارے رویے کی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ اور آج تم اس سادہ دل لڑکی کا گھر' اپنی نام نہاد محبت کے نام پہ

اجاڑنے چلے ہو؟ ارے تم میں خدا کا خوف ہے یا نہیں؟ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"میں اس سے محبت کرتا ہوں ڈیڈی۔ میں مہر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے شکستگی سے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"محبت؟ محبت کے مفہوم سے آشنا بھی ہو تم؟" ان کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ پھیل گئے تھے۔

"محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے حنان۔ یہ بہت سی خاموش قربانیوں کا نام بھی ہے۔ مہر ایک شادی شدہ لڑکی ہے پھر تم نے اپنے جذبات اس سے منسوب کیوں کیے؟ کیوں اس گناہ کا ارتکاب کیا؟

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں اسے تب سے چاہتا ہوں جب مجھے اس کے نکاح کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔" اس انکشاف پہ صغیر صاحب ایک پل کو خاموش ہو گئے تھے۔

"لیکن جب علم ہو گیا تھا۔ تب تمہیں اپنے قدم روک لینے چاہیے تھے۔" ان کا لہجہ بوجھل ہوا۔

"کیوں روک لیتا؟ اس تموز نے مہر کو دیا ہی کیا ہے؟" حنان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

"تموز نے مہر کو کچھ دیا ہے یا نہیں۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تمہارے لیے غور طلب بات صرف یہ ہونی چاہیے کہ کیوں ہم سب کی ہر طرح کی زور زبردستی کے باوجود مہر کبھی اپنے شوہر کا نام' اپنے نام سے الگ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئی۔ کیا تموز بہت چاہنے والا اور قدردان شوہر تھا؟ نہیں۔ وہ مہر کی محبت تھا اس لیے۔" اور حنان باپ کی طرف دیکھتا تھم سا گیا تھا۔

"مہر کے دل و دماغ پہ صرف ایک ہی شخص کا راج ہے اور آج سے نہیں سالہا سال سے ہے۔ وہ اس کی کم عمری کا اولین خواب ہے۔ وہ اس سے لڑ سکتی ہے۔ منہ موڑ سکتی ہے مگر اس تعلق کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسی صورت حال میں تم اگر اسے حاصل کر بھی لو گے تو کیا اس کے دل پہ اپنا نام لکھ پاؤ گے؟ کیا اسے سر تاپا اپنا بنا پاؤ گے کبھی؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تو حنان کے اندر حقیقت کی تلخ گرد اڑنے لگی۔

"نہیں حنان! تم ایسا کبھی نہیں کر پاتے۔ مہر کی زندگی میں اگر تموز ابراہیم سرے سے موجود ہی نہ ہوتا۔ تب بھی تم کم از کم مہر احمد کے دل پہ اپنا نقش نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ تم وہ شخص ہو جس نے گھر کی عزت کو' جسے تمہارے باپ نے اپنی بیٹی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اسے وہ چوٹ پہنچائی جسے وہ کبھی چاہے بھی تو بھلا نہ سکے گی۔ پھر تم اب کس بل بوتے پہ یہ تماشا کر رہے ہو؟ تمہیں تمہاری انتہا پسندی نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ تم اس کھیل میں اس دن ہی ہار گئے تھے جب تم نے اس نو عمر لڑکی کے وجود پہ پہلی آلودہ نگاہ ڈالی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے اپنی اس شکست کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔" پہلی بار زندگی میں پہلی بار اس کے ضمیر نے اس کا احتساب کیا تھا اور اس پہلی ہی کوشش میں وہ لاجواب ہو گیا تھا۔ اس خود احتسابی نے اس کی آنکھوں میں شکستگی کی نمی بکھیر دی تھی۔ جو مقابل کھڑے صغیر صاحب سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھائے اس کے قریب چلے آئے تھے۔

"مہر نے اپنی زندگی میں بہت تکلیفیں دیکھی ہیں حنان۔ خدارا تم تو اسے مزید تکلیف نہ دو۔" بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اس کا فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ حنان کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ آج صحیح معنوں میں اس کے ظرف اور اس کی محبت کا امتحان تھا۔ جس میں وہ پہلی بار یا تو باظرف ٹھہرنے والا تھا یا ہمیشہ کی طرح کم ظرف۔

یک ٹک فون کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں تیرتی نمی کو حلق میں اتارا تھا اور اگلے ہی لمحے ہاتھ بڑھا کر فون پکڑ لیا تھا۔ فیض کا نمبر ملاتے ہوئے اس کے دل میں درد ٹھاٹھیں مار رہا تھا مگر آج اس جیسے ضدی اور اکھڑ نے اپنی آرزوؤں کے جام کو توڑ کر مہر احمد سے وفا کی ٹھان لی تھی۔

لو آج سے ہم بھی رسم وفا کے اسیر ٹھہرے
لو آج ہم نے تمہیں آزاد کردیا

☼ ☼ ☼

قطرہ قطرہ زندگی ثموز ابراہیم کے زخموں اور نیلوں سے چور وجود میں اتاری جارہی تھی۔ جو دواؤں کے زیر اثر اسپتال کے بستر پہ بے سدھ سو رہا تھا۔

وہ اذیت ناک راتوں کے بعد نکلنے والا دن 'ان کی پریشانی کو سمیٹ لے گیا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب ایک نامعلوم گاڑی ثموز کے بے ہوش وجود کو ابراہیم صاحب کے گھر کے باہر پھینک گئی تھی۔ جسے کوئی گھنٹے بھر بعد باہر نکلنے والے دل شیر نے پہچان کر شور مچا دیا تھا۔ آن واحد میں وہ سب بے قرار سے دوڑے چلے آئے تھے۔ اس کی حالت نے ہر غم' ہر درد بھلا دیا تھا۔ ابراہیم ملک بیٹے کو گاڑی میں ڈال کر دیوانہ وار اسپتال کی جانب بھاگے تھے۔ پیچھے ہی دوسری گاڑی میں مہر' ماں' بہنوں اور ساس کو لے کر بھاگی تھی۔

ثموز کی حالت بے حد خراب تھی۔ اسے دو دنوں سے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت کی وجہ سے اس کا نروس سسٹم اچھا خاصا متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے فوراً" سے پیشتر آئی سی یو میں منتقل کردیا تھا۔ اس کی واپسی کی خبر پاکے صغیر صاحب بھی اسپتال دوڑے چلے آئے تھے۔ حنان میں چونکہ مہر کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اس لیے وہ باپ کے ساتھ نہ آیا تھا۔ پولیس بھی ثموز ابراہیم کے مل جانے کی اطلاع پر وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے لے جانے والے کون تھے 'ان کا کیا مقصد تھا؟ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا اور جو جانتا تھا وہ دل میں اپنے اللہ کے حضور اپنے بیٹے کے لیے معافی کا خواستگار تھا۔

مہر جی بھر کے آنسو بہانے کے بعد' دیوار سے سر ٹکائے' غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ثموز کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے خوف نے ان دو دنوں میں اس کی حالت غیر کر ڈالی تھی اور اب جبکہ وہ مل گیا تھا تو اس کے دل پہ وہی جمود ایک بار

پھر چھانے لگا تھا' کیا چاہتی تھی وہ؟ کیا کر رہی تھی وہ؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی گزشتہ دنوں کی تڑپ پہ وہ خود کو شاباش دے یا اپنی ذات پہ نفرین بھیجے۔ اپنی تضحیک' اپنا روندے جانا اور سب سے بڑھ کر سالہا سال ثموز کے ہاتھوں بے وقوف بننا' وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی مگر جب بات ثموز کی جان پر آئی تھی تو وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ کیا سچی محبت کرنے والے سب ہی اتنے بے حمیت اور بے وقعت ہوا کرتے ہیں یا صرف وہی تھی' جس میں انا یا خودداری نام کی کوئی چیز نہ تھی؟ حد تو یہ تھی کہ اب بھی وہ یہ سب باتیں سوچ ضرور رہی تھی مگر خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ اسے یہاں چھوڑ کر واپس لوٹ جاتی۔ کتنی عجیب بات تھی وہ اندر بے ہوش پڑا بھی مہر احمد کو خود سے باندھے رکھنے کی طاقت رکھتا تھا اور وہ باہر ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھتکارنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"ایکسکیوز می۔۔۔ آپ میں سے مہر کون ہیں؟"

ڈاکٹر کی بات پہ وہ جیسے خود میں لوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹر کے منہ سے اس کا نام نہ صرف اسے بلکہ سب ہی کو حیران کر گیا تھا۔

"میں ہوں ڈاکٹر صاحب۔۔۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو ڈاکٹر کی نظریں پل بھر کو اس کے چہرے پر آٹھہریں۔

"سر! آپ انہیں لے کر میرے روم میں آجائیں۔"

ابراہیم صاحب کو مخاطب کرتے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ مہر' بابا کے ساتھ تیز قدموں سے چلتی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ان کے نشست سنبھالنے پر ڈاکٹر نے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"سر! یہ آپ کی بہو ہیں؟"

"جی۔۔۔" ابراہیم صاحب کی الجھن تاحال برقرار تھی۔

"معذرت کے ساتھ۔۔۔ لیکن کیا آپ کے بیٹے اور بہو میں علیحدگی کا کوئی مسئلہ چل رہا ہے؟" انہوں نے رسان سے سوال کیا تو ابراہیم ملک کے ساتھ ساتھ مہر بھی بری طرح چونک گئی۔

"تھوڑی چپقلش ضرور ہے لیکن علیحدگی کی تو کوئی

بات نہیں ہوئی۔" ابراہیم صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ "مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"اس لیے کہ آپ کا بیٹا... نیند کی دواؤں کے زیر اثر بھی اپنی وائف کا نام لے رہا ہے اور کسی طلاق کے کاغذ پر دستخط سے انکار کر رہا ہے۔" ڈاکٹر کی بات پہ ابراہیم صاحب تو ساکت ہوئے ہی تھے لیکن مہر کا پورا جسم سن ہو گیا تھا۔

"تموز ابراہیم اور اس کے لیے بے چین..." بے اختیار اس کے کانوں میں وہ کاٹ دار الفاظ گونجنے لگے تھے، جنہوں نے اس کے دل کو یوں زخمی کیا تھا کہ لہو آج بھی رستا تھا۔

"تھوک کر جاؤں گا اس پہ... اور کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گا۔" مگر اس کے اللہ نے نہ صرف اسے پلٹنے پر بلکہ مہر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دوبارہ دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ اللہ نے اس کی بند آنکھوں میں بھی مہر کے چھن جانے کا خوف منجمد کر دیا تھا۔ کیا اس سے بہتر بھی بھلا کوئی انصاف ہو سکتا ہے؟

☼ ☼ ☼

ابراہیم صاحب کے گھر میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ آج پورے پانچ دن بعد تموز کی اسپتال سے گھر واپسی ہوئی تھی۔

ہوش میں آجانے کے بعد تموز نے رو، رو کے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی تھی اور انہوں نے اسے کیا کہنا تھا بھلا۔ وہ تو اسے پہلے ہی معاف کر چکے تھے۔ مہر البتہ اس کے ہوش میں آنے کا سن کر گھر لوٹ گئی تھی۔ سب نے اسے جاتے دیکھا تھا مگر کسی نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ اس کی واپسی کا سن کے تموز کو چپ لگ گئی تھی۔ آنے والے چار دن وہ اسپتال میں رہا تھا لیکن اس کا انتظار، انتظار رہا تھا۔ مہر دوبارہ نہیں لوٹی تھی۔ تموز کے اغوا کاروں کا کیا مطالبہ تھا اور اس پہ وہاں کیا گزری تھی۔ اس نے بتانے سے انکار کر دیا

تھا۔ وہ جو بھی تھے اور جس کے بھی بندے تھے۔ اس کے حق میں تو بھلا ہی کر گئے تھے۔ اس کے گھر والوں، خاندان والوں کے دل اس کے حق میں نرم ہو گئے تھے اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ مارک کا بھی بے حد شکر گزار تھا۔ جس نے ایک بار پھر خود کو ایک بہترین انسان اور اس کا بہترین دوست ثابت کیا تھا۔ البتہ مہر کی ذات اب تک اس کے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔ وہ کیا ٹھانے بیٹھی تھی، شمروز کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اسے ان اولین لمحوں کے بعد اب تک دیکھا بھی نہ تھا۔ گھر آکر بھی اس کی نظریں بے قراری سے اسے تلاشتی رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی تھی اور کسی سے پوچھنے کا اس کا منہ نہیں پڑ رہا تھا۔

"بابا! میں تھک گیا ہوں۔ مجھے کسی کمرے میں لے چلیں۔" دل اور روح پہ بڑھتے بوجھ نے اس کے کمزور اعصاب کو بہت جلد تھکا دیا تھا۔ یہ گھر اگر اس کے لیے نیا تھا تو اس میں بھی وہ بھلا حق ملکیت جتانے کا حوصلہ کہاں رہا تھا۔

"چلو آؤ۔" ابراہیم صاحب نے آگے بڑھ کے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا اور اپنے ساتھ لیے لاؤنج سے باہر چلے آئے تھے۔ اسے زیادہ وقت نہ ہوا اسی لیے انجم نے اس کے لیے نچلی منزل پہ ہی کمرہ سیٹ کیا تھا۔ کمرہ اس کی پسند کے عین مطابق تھا۔ روشن اور کشادہ۔

"فی الحال تمہاری ماں نے تمہارے لیے یہی کمرہ سیٹ کیا ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تو اپنی مرضی کا کمرہ دیکھ لینا۔" اور باپ کی بات پہ شمروز دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی یہ سوال نہ کر سکا تھا کہ اس کی بیوی کہاں اور کس کمرے میں ہے؟ آیا اس گھر میں موجود بھی ہے یا چھوڑ کر جا چکی ہے۔

"کچھ چاہیے کیا؟" اسے پریشان حال بیٹھا دیکھ کر ابراہیم ملک چونک گئے تھے۔

"چائے کا کہہ دیں بابا۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتے کچن میں چلے آئے تھے لیکن وہاں ملازمہ کے ساتھ مہر کو دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔

"جی بابا؟" اس نے بریانی کی ڈش خالی کرتے ہوئے ابراہیم صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"ہنی کے لیے اس کے کمرے میں چائے بھجوا دو بیٹا۔" اور وہ دھیرے سے "جی" کہتی پلٹ کر کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس کی پشت کو بوجھل نظروں سے دیکھتے ہوئے ابراہیم صاحب ایک گہری سانس لے کر رہ گئے تھے۔ وہ انجم بیگم کے کہنے کے مطابق مہر کی زندگی کے ہر فیصلہ کا اختیار اسے سونپ چکے تھے۔ اب وہ اپنے حق میں کیا فیصلہ کرنے والی تھی یا کر چکی تھی، وہ نہیں جانتے تھے مگر سب کے ساتھ ساتھ ان کی بھی یہی دعا تھی کہ جو بھی فیصلہ ہو۔ ان کے بچوں کے حق میں باعث خیر ہو۔

دروازے پہ دستک کی آواز پر شمروز نے بنا آنکھوں سے بازو ہٹائے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔

"چائے۔" فقط ایک ہی لفظ گونجا تھا اور شمروز کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کی روح کھینچ لی ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو ہٹاتے ہوئے اپنی دائیں جانب دیکھا تھا اور حقیقتاً" پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

"مہر!" اس کی سرگوشی میں برسوں کی پیاس تھی۔ وہ بنا آنکھوں کا طلسم توڑے دھیرے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا یک ٹک خود کو دیکھے جانا مہر کو جھجک کر نگاہیں جھکانے پہ مجبور کر گیا تھا اور یہ منظر شمروز کو اس وقت کی یاد دلا گیا تھا جب پہلی بار وہ اور مہر ائیرپورٹ پہ روبرو ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار جھلملا اٹھی تھیں۔

"میری دعا ہے، اگر یہ کوئی خواب ہے تو میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں اور اگر یہ حقیقت ہے تو خدا میری آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بے خواب کر دے۔" اس کی آواز میں گھلی نمی مہر کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

"آپ بھول رہے ہیں شاید، میں وہی مہر ہوں جس کی طرف آپ نے کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔"

"صحیح کہہ رہی ہو مگر وہ ایک گرے ہوئے انسان کا گرا ہوا فیصلہ تھا اور تمہارا اسیر ہو کر لوٹایا جانا اوپر والے کا فیصلہ ہے۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے سکون سے بولا۔ تو مہر کی حیرت نے اسے پلکیں اٹھانے پر مجبور کردیا۔

"اتنی گہری باتیں کہاں سے سیکھ لیں آپ نے؟"

"جب سے آگاہی نے در وا کیے ہیں اور جب سے ان بے لگام' بے حساب خواہشوں سے نجات پائی ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ دھیرے سے مسکرایا تو مہر کی نظریں' آنسوؤں میں ڈوبے ان سنہری کانچ کے ٹکڑوں سے ہٹ کے اس تل پہ آٹھہری تھیں۔ جو اس کے مسکراتے ہی مہر کو ہمیشہ کی طرح کھلکھلا کے ہنستا محسوس ہوا تھا۔

"یہ تل.... بہت پسند ہے مجھے۔" اور شمروز کے لیے حیرت پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ کیسی فرشتہ صفت لڑکی تھی' نہ کوئی حرفِ ملامت' نہ بدلے میں تحقیر کا تحفہ' وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھا تھا تو وہ دو قدم آگے چلی آئی تھی۔ اس نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس نرمی سے گویا وہ کانچ کی بنی ہو۔

"اور مجھے یہ ہاتھ...." نرمی سے اس کے مومی ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے اگلے ہی لمحے انتہائی محبت سے انہیں ہونٹوں سے لگالیا تو مہر کی پوری جان اس کے ہاتھوں میں سمٹ آئی۔

"یہ آنکھیں...." اس نے ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں کو نرمی سے چوما تھا۔ مہر کی سانس اس کے سینے میں اٹک گئی تھی۔ "یہ چمکتی پیشانی" اس کے لبوں نے عقیدت سے اس کی پیشانی کو چھوا تھا اور مہر کا صبر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے بہتے اشک شمروز کو بری طرح نادم کر گئے تھے۔

"میں نے جس طرح تمہاری ذات اور تمہاری محبت کی تذلیل کی' جس طرح ہر آن تمہیں دھوکا دیا' اس کے لیے میں معافی کے لائق تو نہیں لیکن پھر بھی میری درخواست ہے تم مجھے معاف کردو مہر!" اس کے آنسوؤں کو کرب سے دیکھتے ہوئے وہ ندامت سے چور لہجے میں بولا تو مہر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ شمروز کے لیے اس کی تڑپ کو مزید برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔ اس کے سینے سے لگتے ہی وہ بچوں کی طرح بہ آواز بلند رونے لگی تھی۔

شمروز نے اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے آنسو رکتے رکتے سسکیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"اگر میں نے اپنے فیس بک پہ تصویریں نہ دی ہوتیں تو آپ مجھ تک کیسے پہنچتے ہنی؟" اس کے سینے سے سر اٹھاتے ہوئے مہر نے تشویش سے سوال کیا تو اس سادگی پہ شمروز بے اختیار ہنس پڑا۔

"تو اللہ تعالیٰ وہ کوئی اور راستہ نکال دیتا کیونکہ ایک بات تو طے تھی۔ اس نے مجھے تم تک لوٹانا ہی تھا۔ جانتی ہو کیوں؟" اس کے نفی میں سر ہلانے پر شمروز مسکرا دیا تھا۔

"کیونکہ تم میری پہلی اور آخری پناہ گاہ ہو.... آئی لو یو مہر شمروز!" اسے سینے سے لگاتے ہوئے اس نے اپنا پہلا اقرار محبت اس کے دامن میں ڈالا تھا۔ مہر نے آسودگی سے اپنی آنکھیں موندلی تھیں۔

"آئی لو یو ٹو شمروز ابراہیم!" اس کے رب نے اس کا گلہ دور کردیا تھا۔ اس کا صبر رنگ لایا تھا اور اسے مکمل خوشیوں کی نوید سنا دی گئی تھی۔ مکمل اور بھرپور' بے اختیار مہر کے ذہن میں دو جملوں پر مبنی وہ تحریر گھوم گئی تھی جو آج صبح اسے حنان قاضی کی جانب سے موصول ہوئی تھی۔

"اپنی ضد میں' بہت شدت سے نفرت کی ہے تم سے اور پھر اسی ضد میں' بہت چاہا بھی ہے تمہیں۔ ہو سکے تو اس شدت پسندی کے لیے معاف کر دینا مجھے۔" یہ کیسے ممکن ہوا تھا۔ مہر نہیں جانتی تھی مگر خواہشوں کے اس کھیل میں فتح ہر طرف سے بہت خاموشی سے اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

یہی ہوتا ہے بے غرض اور بے لوث لوگوں کا انجام اور یہی ہے بجام آرزو کا اختتام۔